استاد شہید مرتضیٰ مطہریؒ

جہاد

آیاتِ قرآنی کی روشنی میں
اسلام کے تصورِ جہاد کی وضاحت

(آیاتِ قرآنی کی روشنی میں اسلام کے تصورِ جہاد کی وضاحت)

تقاریر

استاد شہید مرتضٰی مطہریؒ

ترجمہ

سید سعید حیدر زیدی

یکے از مطبوعاتِ

دارالثقلین

پوسٹ بکس نمبر ۲۱۳۳-کراچی ۷۴۶۰۰-پاکستان

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نام کتاب: جہاد

تقاریر: استاد شہید مرتضیٰ مطہریؒ

ترجمہ: سید سعید حیدر زیدی

ناشر: دارالثقلین

تاریخ اشاعت: ربیع الاول ۱۴۲۷ھ اپریل ۲۰۰۶ء

قیمت: ۳۵ روپے

فہرست

✿✿

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عرضِ ناشر

زمانہ قدیم ہی سے غیر مسلموں نے کوشش کی ہے کہ اسلام کو شمشیر کا دین ثابت کیا جائے' اس کی حیرت انگیز پیشرفت اور وسیع پیانے پر قبولیت کو بھی جبر اور زور کا نتیجہ قرار دیا جائے۔ اسلامی احکام کی اصلیت اور گہرائی سے نہ آشنا بعض مسلمان بھی ان کے پھیلائے ہوئے اس تاثر کا شکار ہوئے اور آج بھی بہت سے اسی سے دوچار ہیں۔

موجودہ صدی میں جبکہ عالمِ اسلام نے ایک نئی کروٹ لی ہے اور اس کے مختلف ممالک کے عوام میں اسلام کی جانب بازگشت اور اپنے سیاسی' اقتصادی اور معاشرتی نظاموں کو اسلامی تعلیمات کی بنیاد پر تشکیل دینے کی خواہش بیدار ہوئی ہے' تو اس رجحان اور اس خواہش کو اپنے نقصان میں دیکھنے والے عناصر اور اپنے مفادات کے لئے اسے ضرر رساں سمجھنے والی طاقتیں ایک مرتبہ پھر اس پرانے حربے کے ساتھ میدان میں اُترے ہیں اور اسلام کی دوسری تعلیمات کو ہدفِ تنقید بنانے کے ساتھ ساتھ اسلام کے اصولِ جہاد کو بھی دہشت گردی کے ہم معنی قرار دینے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگائے ہوئے ہیں۔

زیرِ نظر مجموعہ جہاد کے موضوع پر استاد شہید مرتضٰی مطہریؒ کی اُن چار تقاریر پر مشتمل ہے جو انہوں نے قریب ۱۹۷۲ء میں تہران کی ایک مسجد میں منعقد ہونے والے ہفتہ وار اجتماع میں کی

تھیں۔ لہٰذا ان میں استاد مطہری نے نہایت سادہ انداز سے قرآنی آیات کی روشنی میں جہاد کے موضوع کی وضاحت کی ہے' جہاد کے مقصد اور فلسفے کو واضح کیا ہے۔ اہلِ کتاب اور غیر اہلِ کتاب کے خلاف جنگ' جہاد اور آزادیٔ عقیدہ' جہاد اور نجاتِ مستضعفین' جنگ اور جارحیت جیسے موضوعات پر گفتگو کرتے ہوئے اِن حوالوں سے کئے جانے والے بہت سے اعتراضات کے جواب دیئے اور بہت سی غلط فہمیوں کو دور کیا ہے۔

اپنے حجم اور اندازِ بیاں کے لحاظ سے مختصر' ہلکی پھلکی لیکن مفاہیم کی وضاحت اور تفہیم کے اعتبار سے گہری اور وقیع اس کتاب سے قارئین یقیناً مستفیض ہوں گے۔

والسلام

پہلا خطاب

بسم اللہ الرحمن الرحیم

"قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَلَا يُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللهُ وَرَسُوْلُهٗ وَلَا يَدِيْنُوْنَ دِيْنَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ." (۱)

اہلِ کتاب کے خلاف جنگ

یہ آیتِ کریمہ جس کی تلاوت کی گئی اہلِ کتاب کے بارے میں ہے۔ اہلِ کتاب یعنی وہ غیر مسلم جو کسی ایک آسمانی کتاب سے نسبت اور تعلق رکھتے ہیں۔ جیسے یہود نصاریٰ اور شاید مجوس۔

یہ آیت اہلِ کتاب کے خلاف جنگ کے بارے میں ہے۔ اس کے باوجود اس میں یہ نہیں کہا جارہا کہ اہلِ کتاب سے جنگ کرو بلکہ کہتی ہے کہ اہلِ کتاب میں سے جو لوگ خدا پر ایمان نہیں رکھتے، جن کا آخرت پر بھی ایمان نہیں، جو خدا کی جانب سے کیے گئے حلال و حرام کو کوئی اہمیت نہیں دیتے (یعنی خدا کی حرام کی ہوئی چیزوں کو حلال قرار دیتے ہیں) اور جو دینِ حق کے پابند نہیں، جو

۱۔ ان لوگوں کے خلاف جہاد کرو جو خدا اور روزِ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے اور جس چیز کو خدا اور اس کے رسول نے حرام قرار دیا ہے اسے حرام نہیں سمجھتے اور اہلِ کتاب ہوتے ہوئے بھی دینِ حق کی پابندی نہیں کرتے، یہاں تک کہ وہ اپنے ہاتھوں سے ذلت کے ساتھ تمہارے سامنے جزیہ پیش کرنے پر تیار ہو جائیں۔ (سورۂ توبہ ۹۔ آیت ۲۹)

ایسے ہیں ویسے ہیں اُن کے خلاف جنگ کرو یہاں تک کہ وہ جزیہ دینے پر تیار ہو جائیں۔ یعنی اگر وہ جزیہ دینے پر آمادگی کا اظہار کریں اور تمہارے سامنے جھک جائیں تو پھر اس کے بعد اُن سے جنگ نہ کرو۔

اس آیت سے حاصل ہونے والے مفہوم کے بارے میں چند سوال اُبھرتے ہیں' جن کے جواب قرآنِ مجید میں جہاد کے بارے میں موجود دوسری آیات کی مدد سے حاصل کر کے آپ کی خدمت میں بیان کیے جائیں گے۔

ا۔ اہلِ کتاب کے خلاف جنگ مطلق ہے یا مقید؟

اس آیت سے مربوط پہلا سوال اس نکتے پر مشتمل ہے کہ یہاں جو کہا گیا ہے کہ: فَقَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَايُؤْمِنُوْنَ بِاللهِ (ان لوگوں سے قتال کرو جو اللہ پر ایمان نہیں رکھتے) اس سے کیا مراد؟

کیا اس سے مراد یہ ہے کہ تم ان کے خلاف جنگ کی ابتدا کرو' یا یہ ہے کہ جب اُن کی طرف سے کوئی جارحیت محسوس ہو' تب ان کے خلاف جنگ کرو۔

اصولیوں کی اصطلاح میں کیا یہ آیت مطلق ہے؟

کیا ہمارے پاس دوسری آیات موجود ہیں جو مقید ہیں اور کیا یہ لازم ہے کہ ہم مطلق کو مقید پر حمل کریں' یا نہیں؟

مطلق اور مقید کا قاعدہ

ضروری نظر آتا ہے کہ آپ کے لئے اس اصطلاح کی وضاحت کردی جائے۔ کیونکہ اگر ہم اس کی وضاحت نہیں کریں گے' تو آیات کا مفہوم مکمل طور پر معلوم نہ ہو سکے گا۔

ایک حکم اور ایک قانون (خواہ کسی انسان سے صادر ہونے والا ایک حکم اور قانون ہی کیوں نہ ہو) ممکن ہے ایک جگہ مطلق بیان کیا گیا ہو اور دوسری جگہ یہی فرمان اور یہی قانون مقید بیان ہوا ہو۔ اور ہم یہ جانتے ہوں کہ اس حکم کو صادر کرنے والے کا یا اس قانون کو وضع کرنے والے

کا دونوں جگہ ایک ہی مقصد ہے۔ ایسی صورت میں کیا ہمیں اس مطلق کو قبول کر لینا چاہئے اور اس کے بعد یہ کہنا چاہئے کہ جس مقید کا ذکر کیا گیا ہے اس کی ایک خاص علت تھی۔ یا یہ کہ اس مطلق کو اس مقید پر حمل کریں۔ یعنی مقید کو قبول کریں۔

ایک نہایت سادہ سی مثال عرض کرتے ہیں۔ حکم دینے والا ایسا شخص، جس کے حکم کو آپ محترم سمجھتے ہیں' اگر وہ ایک حکم کو دو اوقات میں دو مختلف تعبیروں کے ساتھ دے۔ ایک تعبیر میں آپ سے کہے کہ فلاں شخص کا احترام کرو۔ یہ ایک مطلق حکم ہے۔ یعنی اس میں کوئی قید ذکر نہیں کی گئی' بلکہ فقط اتنا کہا گیا ہے کہ فلاں شخص کا احترام کرو۔

دوسری جگہ وہی شخص آپ کو وہی حکم ان الفاظ میں دیتا ہے کہ اگر فلاں شخص یہ عمل انجام دے' مثلاً اگر ہمارے جلسے میں شرکت کرے تو اس کا احترام کرو۔ یہاں وہ ایک ''اگر'' کا ذکر کرتا ہے' مطلقاً نہیں کہتا کہ احترام کرو' بلکہ کہتا ہے کہ اگر وہ ایسا کرے تو اس کا احترام کرو۔

پہلی تعبیر مطلق ہے' بطورِ مطلق کہا گیا ہے کہ احترام کرو۔ اگر مخاطب ہم ہوں تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ چاہے وہ اس جلسے میں شرکت کرے چاہے اس جلسے میں شرکت سے پرہیز و اجتناب کرے ہمیں اس کا احترام کرنا چاہئے۔ لیکن اگر دوسری تعبیر کو لیں' تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اگر وہ اس جلسے میں آئے تو احترام کرو' اور اگر اس جلسے میں نہ آئے تو نہیں۔

کہتے ہیں کہ قاعدہ تقاضا کرتا ہے کہ ہم مطلق کو مقید پر حمل کریں۔ یعنی کہیں کہ جہاں مطلق ذکر کیا گیا ہے وہاں بھی مراد وہی مقید تھا۔

آیاتِ جہاد میں مطلق و مقید

اب جو مطلق اور مقید قرآنِ مجید میں ذکر ہوئے ہیں' ان کی ایک مثال یہ ہے کہ: قَاتِلُوا الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِاللّٰهِ وَ لَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۔ (سورہ توبہ ۹۔ آیت ۲۹)۔ یعنی وہ لوگ جو خدا' قیامت اور کسی دینِ حق پر ایمان نہیں رکھتے' اور خدا کی طرف سے حرام کردہ کسی چیز کو حرام نہیں سمجھتے' ان کے خلاف جنگ کرو۔ لیکن ایک دوسری آیت ہے کہ: قَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللّٰهِ الَّذِينَ

یُقَاتِلُونَکُمْ (سورۂ بقرہ ۲۔ آیت ۱۹۰) جو لوگ تم سے برسرِ پیکار ہیں تم ان سے جنگ کرو۔ یہاں جو جنگ کرنے کے لئے کہا گیا ہے' تو کیا اس کے معنی یہ ہیں کہ جس وقت وہ تم سے جنگ کرنا چاہتے ہوں اس وقت (ان سے جنگ کرو)' یا نہیں' یہاں مطلق حکم ہے' چاہے وہ تم سے جنگ کرنا چاہیں' چاہے جنگ نہ کرنا چاہیں' چاہے وہ تم پر جارحیت کے مرتکب ہوں چاہے نہ ہوں' (ہرصورت میں) اُن سے جنگ کرو۔

اس مقام پر دو نکتۂ نظر پیش کئے جاسکتے ہیں۔ ایک نکتۂ نظر یہ ہے کہ ہم کہیں کہ مراد ''مطلق'' ہے۔ کیونکہ اہلِ کتاب مسلمان نہیں ہیں' لہٰذا ہم مجاز ہیں کہ ان کے خلاف جنگ کریں۔ ہم ہر غیر مسلم کے خلاف جنگ کے مجاز ہیں' یہاں تک کہ وہ ہمارے سامنے تسلیم ہو جائیں۔

اگر غیر مسلم' اہلِ کتاب نہ ہوں' تو ہمیں چاہئے کہ اُن سے جنگ کریں' یہاں تک کہ وہ مسلمان ہو جائیں یا مارے جائیں۔ اور اگر اہلِ کتاب ہوں' تو اُن کے خلاف اس وقت تک جنگ کریں جب تک وہ مسلمان نہ ہو جائیں' (یا) اگر اسلام قبول نہ کریں' تو ہمارے سامنے تسلیم ہو جائیں اور جزیہ ادا کریں۔ وہ لوگ جن کا خیال ہے کہ (آیت سے) مطلق مراد لی جائے' وہ یہ کہتے ہیں۔

لیکن اگر کوئی کہے کہ مطلق کو مقید پر حمل کیا جانا چاہئے' تو وہ کہتا ہے کہ نہیں' قرآنِ کریم کی وہ آیات جن میں جہاد کے جواز کے مواقع کا ذکر ہوا ہے' اُن کی مدد سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ مطلق مراد نہیں ہے۔

جہاد کن مواقع پر جائز ہے؟

مثلاً ان میں سے ایک موقع وہ ہے جب مخالف فریق آپ سے جنگ کرنا چاہتا ہو' یا یہ کہ مخالف فریق اسلامی دعوت کی نشر و اشاعت میں رکاوٹیں کھڑی کرے۔ یعنی دعوت کی آزادی کو چھین لے اور دعوت کے پھیلاؤ میں حائل ہو اور درحقیقت کوئی مانع اور رکاوٹ پیدا کرے۔ اسلام کہتا ہے کہ اس حائل اور رکاوٹ کو دور کیا جائے۔ یا یہ کہ ان لوگوں نے ایک قوم کو اپنے ظلم و ستم کے

شکنجے میں جکڑ رکھا ہو تو تمہیں چاہیے کہ ان مظلوموں کو نجات دلانے کی خاطر ان سے جنگ کرو۔

لہٰذا اس آیت میں فرماتا ہے: وَ مَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ الْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَ النِّسَآءِ وَ الْوِلْدَانِ (۱) کیوں تم لوگ خدا کی راہ میں اور ان بے چارے مردوں، عورتوں اور بچوں کی راہ میں جنگ نہیں کرتے جنہیں ظلم و ستم کا نشانہ بنایا جا رہا ہے؟

یہاں آپ اس ایک سوال کو اپنے پاس رکھئے، یہاں تک کہ ہم جہاد سے تعلق رکھنے والی تمام آیات کو جمع کریں، انہیں ایک دوسرے سے تطبیق دیں اور دیکھیں کہ ان سے کیا نتیجہ نکلتا ہے۔

۲۔ کیا تمام اہلِ کتاب سے جنگ کی جا سکتی ہے؟

اس آیت میں دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ بنیادی طور پر اس میں اس بات کو اس طرح سے نہیں اٹھایا گیا ہے کہ اہلِ کتاب سے جنگ کرو۔ جب وہ کہتی ہے کہ اہلِ کتاب میں سے ان لوگوں کے خلاف جنگ کرو جو نہ خدا پر اعتقاد رکھتے ہیں نہ پیغمبر کے معتقد ہیں، نہ کسی حرام کو حرام سمجھتے ہیں نہ دینِ حق کے پابند ہیں، تو آخر اس سے مراد کیا ہے؟

کیا مراد یہ ہے کہ جو بھی اہلِ کتاب ہے، مثلاً یہودی یا عیسائی ہے، یا کسی مذہب کا پیروکار ہے، اور وہ خدا، پیغمبر، حرام و حلال اور دینِ حق پر ایمان نہیں رکھتا ہے، یعنی اگر خدا پر ایمان کا دعویٰ کرتا ہے، تو دراصل جھوٹ بولتا ہے، اُسے خدا پر ایمان نہیں ہے؟

درحقیقت یہاں قرآنِ مجید یہ کہنا چاہتا ہے کہ تمام اہلِ کتاب خدا پر ایمان کا دعویٰ کرنے کے باوجود دراصل خدا پر ایمان نہیں رکھتے؟ ممکن ہے ہم یہ کہہ سکیں کہ کیونکہ وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں کہتے ہیں کہ وہ خدا ہیں یا کہتے ہیں کہ وہ خدا کے بیٹے ہیں، لہٰذا وہ خدا پر ایمان نہیں رکھتے۔ یا مثلاً یہودی (خدا پر) ایمان نہیں رکھتے، جیسا کہ ان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ

۱۔ اور آخر تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم اللہ کی راہ میں اور ان لاچار مردوں، عورتوں اور بچوں کے لئے جہاد نہیں کرتے ہو جنہیں لاچار بنا کر رکھا گیا ہے۔ (سورہ نساء ۴۔ آیت ۷۵)

ان کا خدا اس حقیقی خدا کے علاوہ کوئی اور ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ يَدُ اللّٰهِ مَغْلُوْلَةٌ (خدا کے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں۔ سورۂ مائدہ ۵۔ آیت ۶۴) لہٰذا وہ حقیقی خدا پر ایمان نہیں رکھتے اور اسی طرح دوسرے تمام اہلِ کتاب کا معاملہ ہے۔

اگر ہم اس انداز سے بات کریں' تو اسکے معنی یہ ہیں کہ قرآنِ مجید' خدا اور قیامت کے بارے میں غیر مسلموں کے ایمان کو قبول نہیں کرتا۔ کیوں' کس وجہ سے قبول نہیں کرتا؟ اس وجہ سے کہ کہتا ہے کہ در حقیقت ان کے ایمان میں خلل داخل ہے۔ ایک عیسائی (کم از کم ان کے دانشوروں کے طبقے میں) کہتا ہے خدا' اور حتیٰ کہتا ہے خدائے واحد' لیکن اس کے ساتھ ساتھ حضرت عیسیٰ اور حضرت مریم کے بارے میں ایک ایسی بات کہتا ہے جو توحید کے عقیدے کو آلودہ کردیتی ہے۔ بعض مفسرین کی رائے یہ ہے کہ یہ جو قرآن کہتا ہے کہ اہلِ کتاب سے جنگ کرو' اس کی بنیاد پر تمام اہلِ کتاب سے جنگ کی جانی چاہئے' ان میں سے کسی کا بھی خدا پر ایمان درست نہیں' قیامت پر بھی عقیدہ درست نہیں' حلال وحرام کا اعتقاد بھی درست نہیں۔ اس گروہ کے خیال میں اس آیت میں "رسول" سے مراد صرف خاتم الانبیاء ہیں اور دین حق سے مراد وہ دین ہے جسے قبول کرنا آج کے انسان کا فرض ہے' وہ دین نہیں جس کی پابندی کے' ایک خاص زمانے میں لوگ ذمے دار تھے۔

لیکن مفسرین کا دوسرا گروہ کہتا ہے کہ قرآنِ مجید اپنی اس تعبیر کے ذریعے اہلِ کتاب کو دو گروہوں میں تقسیم کرنا چاہتا ہے' وہ یہ کہنا چاہتا ہے کہ تمام اہلِ کتاب ایک سے نہیں ہیں۔ بعض اہلِ کتاب واقعاً خدا پر ایمان رکھتے ہیں' ان سے تمہیں کوئی غرض نہیں ہونی چاہئے۔ واقعاً قیامت پر ایمان رکھتے ہیں' تمہیں ان سے سروکار نہیں ہونا چاہئے۔ خدا کے قانون پر ایمان رکھتے ہیں' انہیں چھوڑ دو۔ لیکن اہلِ کتاب کا وہ گروہ جو نام کا اہلِ کتاب ہے لیکن خدا اور قیامت کے بارے میں ان کا ایمان درست نہیں اور جو واقعاً حرامِ خدا کو (حتیٰ اسے بھی جو خود ان کے دین میں حرام ہے) حرام نہیں سمجھتے' اُن کے خلاف جنگ کرو۔ پس تمام اہلِ کتاب سے نہیں' بلکہ اہلِ کتاب کے

ایک گروہ سے جنگ کرو۔ یہ خود ایک مسئلہ ہے۔

۳۔ جزیہ کیا ہے؟

تیسرا سوال ”جزیہ“ کے بارے میں ہے۔ فرمایا گیا ہے کہ: ان سے جنگ کرو یہاں تک کہ وہ جزیہ ادا کریں۔ یعنی یا تو یہ لوگ اسلام اختیار کرلیں یا پھر جزیہ دیں۔ اس بات میں شک نہیں کہ قرآن کریم اہلِ کتاب اور مشرکین (یعنی وہ بت پرست لوگ جو کسی آسمانی کتاب پر ایمان نہیں رکھتے) کے درمیان ایک فرق کا قائل ہے۔ مشرکین کے بارے میں قرآن کریم کسی ایک بھی جگہ یہ نہیں کہتا کہ ان سے اس وقت تک لڑو جب تک وہ جزیہ ادا نہ کریں اور اگر جزیہ دے دیں تو پھر ان کے ساتھ جنگ نہ کرو۔ یہ فرق قطعی طور پر موجود ہے۔

اس وقت سوال یہ ہے کہ دراصل جزیہ ہے کیا؟ اور جزیہ کا فلسفہ کیا ہے؟

جزیہ کے لغوی معنی کے بارے میں ایک سے زیادہ آراء ہیں۔ بعض لوگوں نے کہا ہے کہ یہ لفظ ”معرب“ ہے عربی نہیں۔ یعنی یہ عربی نہیں فارسی زبان سے تعلق رکھتا ہے اور اصل میں ”گزیت“ ہے۔ ایران میں ساسانیوں کے دور میں نوشیرواں کے زمانے میں جزیہ کو وضع کیا گیا۔ لیکن اغیار کے لئے نہیں بلکہ خود ایرانیوں کے لئے۔ یہ ایک ایسا ٹیکس ہوتا تھا جو فی کس وصول کیا جاتا تھا اور جسے وہ لوگ جنگ کے لئے جمع کرتے تھے۔ اس کے بعد یہ لفظ ایران سے ”حیرہ“ میں آیا جو حالیہ نجف اشرف کے مقام پر ایک شہر تھا۔ حیرہ کے بعد تمام جزیرۃ العرب میں گیا اور وہاں مستعمل ہوا۔

بعض دوسروں کا کہنا ہے کہ صحیح ہے کہ لفظ جزیہ، گزیت یا گزیہ سے انتہائی قریب دکھائی دیتا ہے لیکن دراصل یہ عربی زبان کا لفظ ہے جس کا مادہ جزا ہے۔ اکثر لغویین (اہلِ لغات) یہی عقیدہ رکھتے ہیں۔

فی الحال ہمیں اس کی لغوی بحث سے سروکار نہیں۔ سوال یہ ہے کہ دراصل جزیہ کی ماہیت کیا ہے؟ کیا جزیہ کے معنی خراج ادا کرنا ہے؟ کیا اسلام نے یہ کہا ہے کہ اُن سے اُس وقت تک جنگ

کرو جب تک کہ وہ تم مسلمانوں کو خراج ادا کرنے پر تیار نہ ہو جائیں اور جب وہ خراج ادا کر دیں تو پھر اُن سے جنگ نہ کرو۔ ایک شاعر نے بھی کہا ہے:

ما ئیم کہ از پادشہان باج گرفتیم
زان پس کہ از ایشان کمر و تاج گرفتیم

بہر حال (اگر) جزیہ سے مراد خراج ہے' تو پھر یہ سوال پیش آتا ہے کہ یہ کیا ہے؟ یہ کیسا حکم ہے؟ کیا یہ ایک جابرانہ حکم نہیں ہے؟ حقوق اور عدل و انصاف کے اعتبار سے اس کی کیا بنیاد ہو سکتی ہے' جس کی رو سے اسلام مسلمانوں کو اس بات کی اجازت دیتا ہے' یا اُن پر واجب کرتا ہے کہ وہ دوسرے ادیان کے ماننے والوں کے خلاف جنگ کریں تا کہ وہ یا تو مسلمان ہو جائیں یا خراج ادا کریں؟

ہر دو جانب اشکال و اعتراض کا باعث ہے۔ ان سے جنگ کرو تا کہ وہ اسلام قبول کر لیں۔ یعنی اپنا دین مسلط کرو۔ جنگ کرو تا کہ وہ خراج ادا کریں۔ یعنی ان پر ایک رقم مسلط کرو۔ یہ چیزیں بہر صورت زور زبردستی ہیں۔ یا تو یہ اپنا عقیدہ مسلط کرتا ہے یا ان سے زبردستی مال وصول کرتا ہے۔ اس بارے میں بھی تفصیلی گفتگو کی ضرورت ہے کہ در اصل اسلام میں جزیہ ہے کیا؟ کیا واقعاً خراج ہے یا کچھ اور ہے؟

۴۔ ''صاغرون'' کے معنی

اس کے بعد یہاں (اس آیت میں) ہے ''وَهُمْ صَاغِرُوْنَ'' جبکہ وہ چھوٹے ہو جائیں۔ صاغرون' صغر کے مادے سے ہے اور صغیر یعنی چھوٹا' جب وہ چھوٹے ہو جائیں۔ چھوٹے ہو جائیں کے معنی کیا ہیں؟ یہ چوتھا سوال ہے' کہ یہ لوگ چھوٹے ہو جائیں کے کیا معنی ہیں؟ کیا اس کے معنی یہ ہیں کہ آپ کی طاقت کے سامنے محض سر جھکا دیں' یا یہاں اسلام سر جھکا دینے کے علاوہ بھی کوئی بات چاہتا ہے۔

یہاں اس آیت کے مفہوم اور اس سے متعلق سوالات سے قطع نظر مزید دوسرے مسائل اور

نکات بھی موجود ہیں، جن پر تجزیہ و تحلیل اور بحث و گفتگو کی ضرورت ہے۔

جہاد کا فلسفہ اور مقصد

ایک مسئلہ یہ ہے کہ اسلام نے جہاد کو کس لئے وضع کیا ہے؟

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ دین میں سرے سے جہاد کا وجود ہی نہیں ہونا چاہئے۔ دین میں جنگ کا اصول ہونا ہی نہیں چاہئے۔ اس لئے کہ جنگ ایک بُری چیز ہے، دین کو جنگ مخالف ہونا چاہئے، نہ کہ وہ خود جنگ و جدل کا اصول وضع کرے۔

ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ اسلام کے فروعِ دین میں سے ایک جہاد ہے۔ جب ہم سے پوچھا جاتا ہے کہ فروعِ دین کتنے ہیں، تو ہم کہتے ہیں کہ دس۔ نماز، روزہ، خمس، حج، جہاد وغیرہ۔

عیسائی حضرات اسلام کی جن باتوں کے خلاف غیر معمولی پروپیگنڈہ کرتے ہیں، اُن میں سے ایک یہی (جہاد) ہے۔

جہاد اور عقیدے کی آزادی

وہ کہتے ہیں کہ پہلی بات تو یہ ہے کہ دینِ اسلام میں اس قسم کا اصول کیوں موجود ہے اور دوسری بات یہ ہے کہ اسلام کی طرف سے اس قانونی اجازت کی وجہ سے مسلمانوں نے مختلف اقوام کے خلاف جنگ کی اور طاقت کے زور پر اسلام کو مسلط کیا۔

ان کا کہنا ہے کہ اسلام میں جتنی بھی جنگیں ہوئیں وہ سب کی سب اپنا عقیدہ مسلط کرنے کی جنگیں تھیں۔ اس لئے تھیں کہ طاقت کے زور پر اسلام کو مسلط کیا جائے اور اسلام طاقت کے بل بوتے پر مسلط ہوا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ جہاد حقوقِ انسانی کے ایک عام اصول ''عقیدے کی آزادی'' سے متصادم ہے۔

مشرک اور غیر مشرک کے درمیان فرق

ایک اور مسئلہ جسے ہمیں یہاں بیان کرنا چاہئے، وہ یہ ہے کہ قانونِ جہاد میں اسلام مشرک

اور غیر مشرک کے درمیان فرق کا قائل ہے۔ غیر مشرک کے ساتھ ایک قسم کے میل ملاپ کو اسلام نے جائز قرار دیا ہے' جبکہ اسی چیز کو مشرک کے ساتھ ناجائز سمجھا ہے۔

کیا جزیرۃ العرب اور غیر جزیرۃ العرب کے درمیان فرق ہے؟

ایک اور مسئلہ جسے بیان کرنے کی ضرورت ہے' وہ یہ ہے کہ کیا اسلام نے جزیرۃ العرب اور غیر جزیرۃ العرب کے درمیان فرق رکھا ہے؟ یعنی ایک مقام کو اپنا اصل مرکز قرار دیا ہے اور اپنے اس اصلی مرکز میں نہ وہ مشرک کو قبول کرتا ہے اور نہ اہلِ کتاب کو اجازت دیتا ہے اور اس کا یہ مقامِ اصلی جزیرۃ العرب ہے۔ لیکن جزیرۃ العرب کے سوا دوسرے مقامات کے بارے میں اس قدر سخت گیر نہیں ہے۔ مثلاً (وہاں) مشرکین کے ساتھ مل جل کے رہتا ہے یا اہلِ کتاب کے ساتھ باہمی زندگی بسر کرتا ہے۔

مختصر یہ کہ جزیرۃ العرب اور غیر جزیرۃ العرب کے درمیان فرق ہے یا نہیں؟

اس بات میں کوئی شک نہیں کہ مکہ اور غیر مکہ کے درمیان فرق ہے' جس کا ذکر اس زیر بحث آیت سے پہلے والی آیت میں ہوا ہے: اِنَّمَا الْمُشْرِكُوْنَ نَجَسٌ فَلَا يَقْرَبُوا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ بَعْدَ عَامِهِمْ هٰذَا۔ (بے شک مشرکین نجس ہیں' لہٰذا خبردار اس سال کے بعد وہ مسجد الحرام کے قریب نہ آنے پائیں۔ سورۂ توبہ ۹۔ آیت ۲۸)

لیکن یہ بھی ایک مسئلہ ہے کہ کیا پورے جزیرۃ العرب اور غیر جزیرۃ العرب کے درمیان فرق ہے؟ یا نہیں ایسا نہیں ہے؟

کفار کے ساتھ معاہدے

دوسرا مسئلہ' مشرکین کے ساتھ عہد و پیمان کا مسئلہ ہے۔ کیا مسلمان ان کے ساتھ معاہدہ کر سکتے ہیں' ان سے عہد و پیمان باندھ سکتے ہیں اور اگر ان کے ساتھ معاہدہ کیا ہو تو ان کے ساتھ بننے والا یہ معاہدہ محترم ہے یا محترم نہیں؟ اور کیا ضروری ہے کہ اس معاہدے کا احترام کیا

جائے یا ضروری نہیں ہے؟

جنگ کی نوعیت

اس کے بعد اور بھی مسائل ہیں۔ جس وقت اسلام جنگ کو جائز سمجھتا ہے' تو جنگ کی نوعیت کے حوالے سے کس قسم کی جنگ کو جائز سمجھتا ہے اور کس قسم کی جنگ کو ناجائز قرار دیتا ہے؟

مراد یہ ہے کہ مثلاً کیا قتل عام کو جائز سمجھتا ہے؟ یا نہیں اسے ناجائز قرار دیتا ہے؟ وہ لوگ جنہوں نے تلوار نہیں اٹھائی' جیسے بوڑھی عورتیں' بچے' ایسے لوگ جو اپنی روٹی روزی کمانے میں مشغول ہیں' کیا اسلام ان کے قتل کو جائز سمجھتا ہے؟ یا جائز نہیں سمجھتا؟ یہ بھی ان مسائل میں سے ہے جن پر گفتگو ہونی چاہئے۔

وہ آیات جو جہاد سے تعلق رکھتی ہیں' وہ قرآن کی متعدد جگہوں پر موجود ہیں اور ہم خداوندِ عالم کی توفیق سے اس بات کی کوشش کریں گے کہ جہاد سے تعلق رکھنے والی تمام آیات کو یکجا کر کے اس بارے میں قرآن کا نکتہ نظر حاصل کریں۔

پہلا سوال: جنگ کا جواز

پہلا مسئلہ جہاد کے جواز یا اس کی شرعی حیثیت کے بارے میں ہے۔ اس بارے میں ہے کہ کیا یہ بات صحیح ہے کہ ایک دین میں اور اس کے اصولوں کے درمیان جنگ کا اصول پایا جائے' یا نہیں (یہ بات) درست نہیں ہے؟

اعتراض کرنے والا کہتا ہے کہ نہیں' درست نہیں ہے۔ کیونکہ جنگ ایک بُری چیز ہے اور دین کے لئے بھی لازم ہے کہ وہ ہمیشہ بُرائیوں کا مخالف رہے۔ لہٰذا ضروری ہے کہ دین جنگ کا مخالف ہو۔ یعنی اسے صلح کا طرفدار ہونا چاہئے۔ اور جب وہ جنگ کا مخالف ہو' تو پس اس میں جنگ کا اصول نہیں ہونا چاہئے اور کسی صورت اسے جنگ نہیں کرنی چاہئے۔ عیسائی حضرات اس انداز سے پروپیگنڈہ کرتے ہیں۔ لیکن یہ بات انتہائی کمزور اور بے بنیاد ہے۔

جنگ یا جارحیت؟

کیا جنگ مطلقاً ایک بُری چیز ہے؟ حتیٰ کسی حق کا دفاع کرتے ہوئے بھی، کسی کے حملے اور جارحیت سے بچاؤ کے لئے بھی؟

پس ضروری ہے کہ جنگ کا مورد اور مقصد ہمارے علم میں ہو کہ یہ جنگ کس مقصد اور کس ہدف کے لئے ہے۔ ایک وقت جنگ جارحیت کی صورت میں ہوتی ہے۔ یعنی مثلاً ایک شخص یا ایک قوم دوسروں کے حقوق مثلاً دوسروں کی سرزمین پر طمع و لالچ کی نظر رکھتی ہے، ان کے مال و دولت کو ہتھیانا چاہتی ہے، یا وہ اقتدار طلبی اور تسلط کی نیت رکھنے کی وجہ سے دعویٰ کرتی ہے کہ ہماری قوم تمام قوموں پر فوقیت رکھتی ہے، تمام اقوام پر برتر قوم ہے، پس اسے تمام دوسری اقوام پر حکومت کرنی چاہئے۔

یہ مقاصد غلط مقاصد ہیں۔ ایسی جنگ جو کسی سرزمین پر قبضے کے لئے ہو، یا لوگوں کے مال و دولت کو ہتھیانے کے لئے ہو، یا لوگوں کی تحقیر کے لئے ہو، اس کی بنیاد یہ ہو کہ یہ لوگ کم تر نسل سے تعلق رکھتے ہیں اور ہم برتر نسل سے ہیں اور برتر نسل کو کم تر نسل پر حکومت کرنی چاہئے، تو اسے جارحیت کہتے ہیں۔ یہ جنگ قطعی طور پر بُری ہے، اس بات میں کوئی شک نہیں۔

عقیدہ مسلط کرنے کی خاطر جنگ پر ہم علیحدہ سے گفتگو کریں گے۔

دفاعی جنگ

لیکن اگر جنگ، جارحیت سے دفاع کے لئے ہو، اگر کسی دوسرے نے ہماری سرزمین پر جارحیت کی ہو، یا وہ ہمارے مال و دولت کو ہتھیانا چاہتا ہو، ہماری حریت و آزادی اور اقتدار پر نظر رکھے ہو اور اسے چھیننا چاہتا ہو، یا ہم پر اپنا اقتدار مسلط کرنا چاہتا ہو۔

اس مقام پر دین کا موقف کیا ہونا چاہئے؟

کیا اسے یہ کہنا چاہئے کہ جنگ مطلق بُرائی ہے، اسلحہ ہاتھ میں لینا بُری بات ہے، شمشیر

انتہائی بُری بات ہے، ہم صلح کے حامی و طرفدار ہیں!!

یہ واضح طور پر ایک مضحکہ خیز بات ہوگی۔ مخالف ہم سے جنگ پر تلا بیٹھا ہے، اُس نے ہمیں برباد کرنے کے ارادے سے ہم پر جنگ مسلط کی ہے، ہم اُس کے خلاف جنگ نہ کریں اور صلح کو جواز قرار دے کر اپنا دفاع نہ کریں! تو یہ صلح نہیں، سرِ تسلیم خم کر دینا اور ذلت قبول کرنا ہے۔

صلح کرنے اور سرِ تسلیم خم کرنے میں فرق ہے

اس مقام پر ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ کیونکہ ہم صلح کے طرفدار ہیں، اس لئے اس جنگ کے مخالف ہیں۔ اس کے معنی یہ ہوں گے کہ ہم ذلت کے طرفدار ہیں، سرِ تسلیم خم کر دینے کے حامی ہیں۔

کوئی غلط فہمی نہیں رہنی چاہئے کہ ان دونوں باتوں (صلح اور سرِ تسلیم خم کر دینے) کے درمیان زمین آسمان کا فرق ہے۔

صلح کے معنی ہیں، عزت و شرافت کے ساتھ باہمی تعلقات، لیکن یہ (سرِ تسلیم خم کر دینا) آبرومندانہ باہمی تعلقات نہیں، بلکہ اس انداز سے مل کے رہنا ہے کہ اس میں ایک فریق کے لئے عین بے عزتی ہے بلکہ دونوں ہی فریقوں کے لئے بے عزتی ہے۔ ایک فریق کے لئے تجاوز اور زیادتی کرنے کی بے عزتی اور دوسرے فریق کے لئے ظلم کے مقابل تسلیم ہو جانے، گھٹنے ٹیک دینے کی بے عزتی۔

پس اس مغالطے کا خاتمہ ہونا چاہئے۔ اگر کوئی یہ کہے کہ میں جنگ کا مخالف ہوں اور جنگ مطلقاً بُری چیز ہے چاہے یہ جنگ جارحیت کی صورت میں ہو، چاہے جارحیت سے دفاع اور اس سے مقابلے کے لئے جنگ کی جائے، تو ایسا شخص غلط فہمی کا شکار ہے۔ جارحیت یقینی طور پر بُری چیز ہے اور جارحیت کے مقابل ڈٹ جانا، اُس کا مقابلہ کرنا یقینی طور پر اچھی چیز اور انسانی زندگی کی ضرورت میں سے ہے۔

قرآن کریم بھی اس نکتے کی جانب اشارہ کرتا ہے۔ بلکہ واضح طور پر کہتا ہے۔ ایک مقام پر فرماتا ہے: وَ لَوْ لَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّفَسَدَتِ الْاَرْضُ (اور اگر اسی طرح

خدا بعض کو بعض کے ذریعے نہ روکتا تو ساری زمین میں فساد پھیل جاتا۔ سورۂ بقرہ ۲۔ آیت ۲۵۱) ایک اور جگہ فرماتا ہے: لَهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَ بِيَعٌ وَّ صَلَوٰتٌ وَّ مَسٰجِدُ يُذْكَرُ فِيْهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِيْرًا (تمام گرجے اور یہودیوں کے عبادت خانے اور مجوسیوں کی عبادت گاہیں اور مسجدیں جن میں کثرت کے ساتھ خدا کا ذکر کیا جاتا ہے سب منہدم کر دیئے جاتے۔ سورۂ حج ۲۲۔ آیت ۴۰)

اگر خداوند عالم بعض انسانوں کے ذریعے بعض دوسرے انسانوں کا راستہ نہ روکے تو فساد و بربادی پوری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لے۔ لہٰذا دنیا کے تمام ممالک اپنی مملکت کے لئے دفاعی قوت کو واجب و لازم سمجھتے ہیں۔ ایک ایسی فوج جس کی ذمے داری جارحیت کی روک تھام ہو اس کا وجود لازم اور ضروری ہے۔ اب ایک ملک دوسروں پر جارحیت کے لئے فوج رکھتا ہے ایک اپنے دفاع کے لئے فوج رکھتا ہے۔ یہ نہ کہئے گا کہ وہ ملک جس کے پاس فوج ہے اور وہ جارحیت نہیں کرتا تو اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ کمزور ہے اگر اس کے پاس قوت ہوتی تو وہ بھی جارحیت کرتا۔ ہمیں اس بات سے کوئی سروکار نہیں، ہر ملک کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ وہ اپنے دفاع کے لئے فوج رکھے۔ اسے اس قدر طاقتور ہونا چاہئے کہ جارح کا راستہ روک سکے۔ اس بارے میں قرآن کریم فرماتا ہے: وَ اَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّ مِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَ عَدُوَّكُمْ (سورۂ انفال ۸۔ آیت ۶۰) جس حد تک ممکن ہو طاقت تیار کرو اپنی سرحدوں پر طاقت جمع کرو۔ رباط 'ربط' سے ماخوذ ہے۔ ربط یعنی باندھنا۔ رباط الخیل یعنی بندھے ہوئے گھوڑے۔ اس تعبیر کا ذکر اس وجہ سے کیا گیا ہے کہ قدیم زمانے میں اکثر طاقت گھوڑوں کی شکل میں ہوتی تھی۔ البتہ ہر زمانے میں طاقت کی ایک خاص شکل و صورت ہوتی ہے۔ قرآن کریم کہتا ہے کہ اس مقصد کے لئے طاقت تیار کرو، طاقتور بنو کہ دشمن کے دل پر تمہارا رعب بیٹھے اور دشمن تمہاری سرحدوں میں جارحیت کا خیال بھی اپنے دماغ میں نہ لائے۔

اسلام اور عیسائیت میں فرق

کہتے ہیں کہ عیسائیت کو یہ افتخار حاصل ہے کہ اس میں جنگ نام کی کوئی چیز نہیں پائی جاتی۔ لیکن ہم کہتے ہیں کہ اسلام کو یہ افتخار حاصل ہے کہ اس میں اصول جہاد موجود ہے۔ عیسائیت میں جہاد اس لئے نہیں ہے کہ اس میں کچھ ہے نہیں۔ اسکے پاس عیسائیت کی بنیاد پر معاشرہ' قانون اور اجتماعی تنظیم ہی نہیں کہ اصول جہاد بھی پایا جائے۔

عیسائیت میں کچھ ہے ہی نہیں' کل چار اخلاقی احکام ہیں۔ سچ بولو' جھوٹ نہ بولو' لوگوں کا مال نہ کھاؤ جیسی چند نصیحتیں ہیں۔ یہ چیزیں جہاد نہیں چاہتیں۔ اسلام ایک ایسا دین ہے جو ایک معاشرے کی تشکیل کو اپنا فریضہ' اپنی ذمے داری سمجھتا ہے۔ اسلام اس لئے آیا ہے تا کہ ایک مملکت تشکیل دے' ایک حکومت تشکیل دے۔ اس کی ذمے داری' اس کا پیغام دنیا کی اصلاح ہے۔ اس قسم کا دین لاتعلق نہیں رہ سکتا۔ ایسا نہیں ہو سکتا کہ اس میں جہاد کا اصول نہ ہو۔ اسی طرح یہ بھی ممکن نہیں کہ اس کی بنیاد پر قائم ہونے والی مملکت میں فوج نہ ہو۔

عیسائیت کا دائرہ محدود ہے' جبکہ اسلام کا دائرہ وسیع ہے۔ عیسائیت چند نصیحت سے آگے نہیں بڑھتی لیکن اسلام انسانی زندگی کے تمام شعبوں کو پیش نظر رکھتا ہے۔ اس کے پاس سماجی قانون ہے' اقتصادی قانون ہے' سیاسی قانون ہے۔ یہ ایک مملکت کی' ایک حکومت کی تشکیل کے لئے آیا ہے۔ لہذا کیسے ممکن ہے کہ اس میں فوج نہ ہو؟ کیسے ہو سکتا ہے کہ اس میں اصول جہاد نہ ہو؟

اسلام اور صلح

پس ایک گروہ کا یہ کہنا درست نہیں کہ دین کو ہمیشہ جنگ کا مخالف ہونا چاہئے۔ یعنی اسے صلاح کا حامی ہونا چاہئے' جنگ کا طرفدار نہیں۔ کیونکہ جنگ مطلقاً ایک بُری چیز ہے۔

ہاں دین کو صلح کا طرفدار ہونا چاہئے۔ قرآن کریم بھی کہتا ہے کہ: وَالصُّلْحُ خَيْرٌ (صلح بہتر ہے۔ سورۂ نساء۔ آیت ۱۲۸)' اس کے باوجود اسے جنگ کا طرفدار بھی ہونا چاہئے۔ یعنی

جب مخالف فریق باعزت بقائے باہمی پر تیار نہ ہو ظالم ہو انسانی شرافت کو پامال کرنے پر تُلا بیٹھا ہو اور اگر ہم اس کے سامنے سر جھکا دیں تو یہ ذلت قبول کرنے کے مترادف ہے اور اس طرح ہم نے ایک دوسری شکل میں بے عزتی کو اپنے اوپر مسلط کر لیا ہے۔ اسلام کہتا ہے کہ صلح اس صورت میں ہونی چاہئے جب مقابل فریق صلاح کے لئے آمادہ اور اس پر رضامند ہو اور جنگ اس صورت میں ہونی چاہئے جب مخالف فریق جنگ کا طلب گار ہو۔

جنگ کی شرائط

دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ اسلام کن حالات میں کہتا ہے کہ جنگ کرو۔ قرآنِ کریم میں جہاد کے بارے میں آنے والی اولین آیات (نص اور تمام مفسرین کی متفقہ رائے میں) سورۂ حج کی درج ذیل آیات ہیں:

"اِنَّ اللّٰهَ يُدٰفِعُ عَنِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ خَوَّانٍ كَفُوْرٍ. اُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا وَ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى نَصْرِهِمْ لَقَدِيْرٌ. اۨلَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ بِغَيْرِ حَقٍّ اِلَّاۤ اَنْ يَّقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ وَ لَوْ لَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَ بِيَعٌ وَّ صَلَوٰتٌ وَّ مَسٰجِدُ يُذْكَرُ فِيْهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِيْرًا وَ لَيَنْصُرَنَّ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِيٌّ عَزِيْزٌ. اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَ اَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَ نَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ وَ لِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ." (۱)

۱۔ بے شک اللہ صاحبانِ ایمان کی طرف سے دفاع کرتا ہے اور یقیناً اللہ خیانت کرنے والے کافروں کو ہرگز دوست نہیں رکھتا۔ جن لوگوں سے مسلسل جنگ کی جا رہی ہے انہیں ان کی مظلومیت کی بنا پر جہاد کی اجازت دیدی گئی ہے اور یقیناً اللہ ان کی مدد پر قدرت رکھنے والا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے گھروں سے ناحق نکال دیے گئے ہیں ماسوا اسکے کہ وہ یہ کہتے ہیں کہ ہمارا پروردگار اللہ ہے۔ اور اگر خدا بعض لوگوں کو (بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

کیسی عجیب آیات ہیں۔ یہ قانونِ جہاد کے بارے میں آنے والی قرآن کریم کی اوّلین آیات ہیں۔

مسلمان مکہ میں

ایک مقدمہ عرضِ خدمت ہے۔ جیسا کہ ہم جانتے ہیں وحی پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر چالیس سال کی عمر میں مکہ میں نازل ہوئی۔ آپ نے تیرہ برس مکہ میں بسر کئے۔ ان تیرہ برسوں میں آپ اور آپ کے اصحاب کو کفارِ قریش کی طرف سے غیر معمولی مظالم اور اذیت و آزار کا سامنا کرنا پڑا۔ یہاں تک کہ کچھ لوگ اس بات پر مجبور ہوئے کہ رسول کریم کی اجازت سے مکہ سے ہجرت کر جائیں۔ یہ لوگ ہجرت کر کے حبشہ چلے گئے۔

مسلمانوں نے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بارہا اپنے دفاع کی اجازت طلب کی پیغمبر اکرم نے مکہ میں رہتے ہوئے تیرہ برس تک انہیں اس کی اجازت نہیں دی' اس کا بھی ایک فلسفہ ہے۔ یہاں تک کہ (مکہ میں) حالات غیر معمولی حد تک سخت ہو گئے اور دوسری طرف یہ ہوا کہ مکہ سے باہر بشمول مدینہ میں اسلام پھیلنے لگا۔ مدینہ سے تعلق رکھنے والے افراد کا ایک چھوٹا سا گروہ مسلمان ہو گیا تھا' انہوں نے آ کر پیغمبر کی بیعت کر لی تھی اور اس بات کا عہد کیا تھا کہ اگر آنحضرت مدینہ تشریف لائیں گے تو وہ ان کی مدد کریں گے۔

پیغمبر اسلام نے ہجرت فرمائی اور آہستہ آہستہ مسلمان بھی ہجرت کر کے مدینہ آنے لگے اور پہلی مرتبہ مدینہ میں ایک مستقل مرکز وجود میں آیا۔

(بقیہ پچھلے صفحے کا حاشیہ) بعض کے ذریعے نہ روکتا ہوتا تو تمام گرجے اور یہودیوں کے عبادت خانے اور مجوسیوں کی عبادت گاہیں اور مسجدیں جن میں کثرت کے ساتھ خدا کا ذکر کیا جاتا ہے سب منہدم کر دیے جاتے اور اللہ اپنے مددگاروں کی یقیناً مدد کرے گا کہ وہ یقیناً صاحب قوت بھی ہے اور صاحب عزت بھی ہے۔ یہی وہ لوگ ہیں جنہیں ہم نے زمین میں اختیار دیا تو انہوں نے نماز قائم کی اور زکات ادا کی اور نیکیوں کا حکم دیا اور برائیوں سے روکا اور یہ طے ہے کہ تمام امور کا انجام خدا کے اختیار میں ہے۔ (سورۂ حج ۲۲۔ آیت ۳۸ تا ۴۱)

(ہجرت کے) پہلے سال بھی دفاع کی اجازت نہیں دی گئی۔ ہجرت کا دوسرا سال تھا کہ پہلی مرتبہ آیات جہاد نازل ہوئیں۔ (یہ وہی آیات ہیں)

دیکھئے آیات کا لہجہ کیا ہے: اِنَّ اللّٰہَ یُدٰفِعُ عَنِ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا۔ خدا اہلِ ایمان کا دفاع کرتا ہے' اللہ تعالیٰ کافر پیشہ خائنوں کو پسند نہیں کرتا۔ یہ اس بات کی جانب اشارہ ہے کہ ان لوگوں نے تمہارے ساتھ خیانت کی ہے' ان لوگوں نے کفرانِ نعمت کیا ہے۔

پھر فرماتا ہے: اُذِنَ لِلَّذِیْنَ یُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّھُمْ ظُلِمُوْا۔ ان لوگوں کو جنگ کی اجازت دیدی گئی ہے جن سے دوسرے (لوگ) جنگ کے لئے آ گئے ہیں۔ یعنی اے مسلمانو! اب جبکہ کفار تم سے جنگ کرنے کے لئے آ گئے ہیں' تو تم ان سے جنگ کرو۔ یہ ٹھیک دفاعی حالت ہے۔

اس بات کی اجازت کس بنیاد پر دی گئی؟

اس بنیاد پر کہ مظلوم کو اپنا دفاع کرنا چاہئے۔

اس کے بعد خداوند عالم اپنی مدد و نصرت کا وعدہ کرتا ہے۔ وَ اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی نَصْرِھِمْ لَقَدِیْرُ۔ اَلَّذِیْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِیَارِھِمْ بِغَیْرِ حَقٍّ اِلَّآ اَنْ یَّقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰہُ۔ ہم ان لوگوں کو جہاد کی اجازت دیتے ہیں' جنہیں ان کے شہر و دیار سے ناحق صرف اس جرم میں نکالا گیا ہے کہ وہ یہ کہتے تھے کہ ہمارا پروردگار خدا ہے۔ ان کا جرم صرف یہ تھا کہ وہ کہتے تھے: رَبُّنَا اللّٰہُ۔ ہم ایسے لوگوں کو جنگ کی اجازت دیتے ہیں۔

دیکھئے اس لہجے میں کس قدر دفاع کا انداز ہے۔ اس کے بعد جہاد کے کلی فلسفے کا ذکر کرتا ہے۔ قرآن کریم حقائق کے بیان اور نکات کی یاد دہانی کے سلسلے میں عجیب ہے۔ یہ جملہ کہنے کے بعد قرآن کریم اُن سوالات اور اعتراضات کا سامنا کرتا ہے جو عیسائی کیا کرتے ہیں. کہ اے قرآن تو ایک آسمانی کتاب ہے' تو ایک دینی کتاب ہے' تو کیسے جنگ کی اجازت دیتا ہے؟ جنگ تو بری چیز ہے' تجھے تو صرف صلح کی بات کرنی چاہئے' تجھے تو آشتی کی بات کرنی چاہئے' تجھے تو عبادت کی تلقین کرنی چاہئے۔

قرآنِ کریم کہتا ہے: نہیں۔ اگر فریق ثانی کی طرف سے جارحیت کا آغاز کیا جائے اور فریق اوّل دفاع نہ کرے' پتھر کا جواب پتھر سے نہ دے' تو کوئی عبادت گاہ بھی باقی نہیں رہے گی: وَ لَوْ لَا دَفْعُ اللّٰہِ النَّاسَ بَعْضَھُمْ بِبَعْضٍ لَّھُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَ بِیَعٌ وَّ صَلَوٰتٌ وَّ مَسٰجِدُ یُذْکَرُ فِیْھَا اسْمُ اللّٰہِ کَثِیْرًا ۔ اگر خدا بعض لوگوں کے ذریعے بعض دوسروں کی جارحیت اور تجاوز کو نہ روکے تو یہ تمام صومعے' عبادت کے مراکز ختم ہو جائیں۔ یہودیوں کے مراکز ختم ہو جائیں' صوفیوں کے مراکز تباہ ہو جائیں۔ مسلمانوں کی عبادت کی مسجدیں ختم ہو جائیں۔ یعنی ایک فریق حملہ کرے گا اور پھر کسی کو اس بات کی آزادی حاصل نہ ہو گی کہ اس شکل میں خدا کی عبادت کرے۔

اس کے بعد قرآنِ کریم مدد و نصرت کا وعدہ بھی کرتا ہے: وَ لَیَنْصُرَنَّ اللّٰہُ مَنْ یَّنْصُرُہٗ اِنَّ اللّٰہَ لَقَوِیٌّ عَزِیْزٌ ۔ جو کوئی خدا کی مدد کرتا ہے' یعنی حق و حقیقت کا ساتھ دیتا ہے' تو خدا اس کی مدد کرتا ہے۔ خدا قوی اور غالب ہے۔

اس کے بعد دیکھئے قرآنِ کریم کس طرح ان لوگوں کے اوصاف بیان کرتا ہے جن کی خدا مدد کرتا ہے۔ خدا ان لوگوں کی مدد کرتا ہے جو خود اپنا دفاع کرتے ہیں۔ وہ لوگ جو ایک حکومت تشکیل دیتے ہیں' ان کی خصوصیت یہ ہوتی ہے: اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّکَّنّٰھُمْ فِی الْاَرْضِ ۔ وہ لوگ کہ جب ہم انہیں زمین میں جگہ دیتے ہیں اور ان کی حکومت کو مستقر کرتے ہیں' وہ لوگ کہ جب ہم انہیں قدرت و قوت دیتے ہیں' انہیں اقتدار دیتے ہیں تو وہ یہ کرتے ہیں' کیا کرتے ہیں؟ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ ۔ خدا کی عبادت کا اہتمام کرتے ہیں۔ وَ اٰتَوُا الزَّکٰوۃَ ۔ زکات ادا کرتے ہیں۔

نماز خدا کے ساتھ صحیح معنوں میں وابستگی کا کنایہ ہے اور زکات انسانوں کے صحیح صحیح باہمی تعلقات کا کنایہ۔ وہ لوگ جو خلوص کے ساتھ خدا کی پرستش کرتے ہیں اور ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں' اور: وَ اَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَ نَھَوْا عَنِ الْمُنْکَرِ ۔ اپنے آپ کو اچھائیوں کی ترویج اور برائیوں اور خرابیوں کے خلاف جنگ کا پابند سمجھتے ہیں۔ وَ لِلّٰہِ عَاقِبَۃُ الْاُمُوْرِ ۔ اور معاملات کا انجام کار خدا کے ہاتھ میں ہے۔

یہاں تک (کی گفتگو سے) ہمارے علم میں یہ بات آئی ہے کہ بنیادی طور پر قرآن کریم نے جس جہاد کو وضع کیا ہے وہ جارحیت' غلبے اور تسلط کے لئے نہیں ہے' بلکہ جارحیت کے خلاف جنگ کے طور پر ہے۔

البتہ ہم عرض کریں گے کہ یہ جارحیتیں جن کا مقابلہ کرنا ضروری ہے' ان کی ہمیشہ یہ صورت نہیں ہوتی کہ مخالف آپ کی سرزمین پر جارحیت کرتا ہے۔ ممکن ہے جارحیت کی صورت یہ ہو کہ کسی نے خود اپنی سرزمین پر ایک ضعیف اور ناتواں گروہ کو' قرآن کی اصطلاح میں مستضعفین کو ظلم و زیادتی کا نشانہ بنایا ہوا ہو۔ اس صورت میں آپ لاتعلق نہیں رہ سکتے۔ آپ کی ذمے داری ہے کہ آپ انہیں آزاد کرائیں۔ یا کسی اور نے (اپنے یہاں) ایسا گھٹن زدہ ماحول پیدا کیا ہوا ہو کہ وہاں دعوتِ حق کے فروغ کا امکان نہ ہو' رکاوٹ حائل کی ہوئی ہو' دیوار کھڑی کی ہوئی ہو' تو ایسی صورت میں ہمیں چاہئے کہ اس دیوار کو ڈھادیں' کیونکہ یہ سب باتیں جارحیت ہیں۔

لوگوں کو فکری اور غیر فکری پابندیوں سے آزاد کرانا چاہئے۔ ان تمام صورتوں میں جہاد کی ضرورت ہے' اور ایسا جہاد ظلم یعنی جارحیت کے خلاف دفاع ہے' مقاومت ہے۔ عام معنی میں دفاع سے مراد ایک موجود ظلم کے خلاف جنگ ہے۔ بہر صورت ہمیں طرح طرح کے مظالم اور جارحیتوں کے حوالے سے گفتگو کرنی چاہئے جن کے خلاف اسلام کی رو سے جنگ و جہاد ضروری ہے۔

✿✿

دفاع یا جارحیت

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

" قَاتِلُوا الَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ وَ لَا بِالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَ لَا یُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰہُ وَرَسُوْلُهٗ وَ لَا یَدِیْنُوْنَ دِیْنَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ حَتّٰی یُعْطُوا الْجِزْیَةَ عَنْ یَّدٍ وَّ ھُمْ صٰغِرُوْنَ."

اسلام پر عیسائیت کی تنقید

جیسا کہ ہم پہلے عرض کر چکے' دنیائے عیسائیت اپنے نکتہ نظر سے جن چیزوں کو اسلام کے کمزور پہلو سمجھتی ہے ان میں اسلامی جہاد (بھی شامل) ہے۔ اُن کا کہنا ہے کہ اسلام جنگ و جدال کا دین ہے صلح و صفائی کا دین نہیں' جبکہ عیسائیت صلح و آشتی کا دین ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ جنگ سراسر بُری چیز ہے اور صلح اچھی بات۔ لہٰذا ایک ایسا دین جو خدا کی طرف سے ہے' اُسے صلح کا طرفدار ہونا چاہئے' جو ایک اچھی چیز ہے' نہ کہ جنگ کا طرفدار' جو ایک بُری چیز ہے۔

البتہ ماضی کی عیسائیت' اخلاق کے پہلو سے' مخصوص عیسائی اخلاق کے پہلو سے' وہ اخلاق جو یہ کہتا ہے کہ اگر کوئی آپ کے دائیں رخسار پر طمانچہ مارے تو اس کے سامنے اپنا بایاں رخسار پیش

کمزور ضعیف پروری کا اخلاق (رکھنے والی عیسائیت کا یہ موقف تھا)۔ لیکن آج کی عیسائیت نے اپنا چہرہ بدل لیا ہے۔ دوسرے زاویے سے دیکھتی ہے اور دوسرے راستے سے داخل ہوتی ہے' حق کی راہ سے' انسان کے فطری حق کی راہ سے' آزادی کے حق کے راستے سے اور اس راہ سے کہ جنگ مکمل طور پر آزادی کے حق کے برخلاف ہے۔ (جنگ) عقیدے کی آزادی' اختیار اور ارادے کی آزادی' مذہب کے انتخاب کی آزادی' ملیت کی آزادی وغیرہ کے خلاف ہے۔

ہم ان دونوں پہلوؤں سے معاملے کا جائزہ لیں گے۔ اخلاق اور اخلاقی معیارات کے پہلو سے بھی اور حقوق انسانی اور جدید انسانی پیمانوں کے پہلو سے بھی۔ ہم نے اس مسئلے کا جواب اس سے پہلی نشست میں بھی بیان کیا تھا۔ بہت واضح اور صاف جواب تھا کہ (ان کا) یہ کہنا درست نہیں ہے۔

جارحیت بُری چیز ہے' جنگ نہیں اور ہر جنگ جارحیت نہیں ہوتی

اس بات میں کوئی شک نہیں کہ صلح اچھی چیز ہے۔ اور اُن لوگوں کے خلاف جو حملہ آور سے کوئی سروکار نہیں رکھتے' اس معاشرے سے بھی کوئی واسطہ نہیں رکھتے' اُن کی سرزمینوں پر قبضے کے لئے' اُن کے اموال لوٹنے کے لئے' اُنہیں غلام اور اپنا محکوم بنانے کے لئے جارحیت کے طور پر جنگ کے بُرا ہونے میں بھی کوئی شک نہیں۔ دراصل جو چیز بُری ہے وہ جارحیت ہے' جارحیت بُری چیز ہے لیکن کسی کی طرف سے بھی ہونے والی ہر جنگ جارحیت نہیں ہوتی ہے۔ ممکن ہے یہ (جنگ) جارحیت ہو اور یہ بھی امکان ہے کہ جارحیت کا جواب ہو۔ کیونکہ کبھی کبھی جارحیت کا جواب بھی قوت کے ساتھ دینا لازم ہو جاتا ہے۔ یعنی جب جارحیت کا جواب دینے کے لئے قوت کے استعمال کے سوا کوئی اور راستہ موجود نہ ہو۔

صلح' نہ کہ ذلت قبول کرنا

ایک دین اگر ایک جامع دین ہو تو اس کے لئے ضروری ہے کہ اس میں ایسی صورتحال کے

بارے میں بھی چارہ جوئی کی گئی ہو جب اسے جارحیت کا نشانہ بنایا جائے' اور اگر بالفرض خود اس پر جارحیت نہ ہو' بلکہ دوسروں پر جارحیت کی گئی ہو' تو اس کا طرز عمل کیا ہو؟ (اس بارے میں بھی رہنمائی موجود ہو)

ایسے وقت کے لئے جنگ و جہاد کا قاعدہ مقرر کیا جانا ضروری ہے۔

کہتے ہیں کہ صلح اچھی چیز ہے۔ ہم بھی مانتے ہیں کہ صلح اچھی چیز ہے۔ لیکن ذرا یہ بتایئے کہ ذلت قبول کر لینا اور سر تسلیم خم کر دینا کیسا ہے؟ (کیا) ذلت قبول کرنا اور سر تسلیم خم کر دینا بھی اچھی بات ہے؟

اگر دو طاقتیں باہم مساوی ہوں اور صلح و سلامتی کی طرفدار ہوں' ان میں سے ہر ایک آج کی زبان میں پر امن بقائے باہمی کے اصول کے تحت زندگی بسر کرنا چاہے' نہ یہ' اس پر چڑھائی کا ارادہ رکھے' نہ وہ اس کے خلاف جارحیت کی خواہش کرے۔ بلکہ دونوں ایک دوسرے کے حقوق کا لحاظ کرتے ہوئے باہمی احترام کی بنیاد پر امن و آشتی کے ساتھ رہنا چاہیں' تو اس کا نام صلح ہے' یہ اچھی چیز ہے' اسے ہونا چاہئے۔

لیکن اگر کبھی ایسا ہو کہ ایک فریق جارحیت کرے' اور دوسرا فریق اس بنیاد پر کہ جنگ بُری چیز ہے اس کے سامنے تسلیم ہو جائے' گھٹنے ٹیک دے۔ یعنی طاقت کے سامنے جھک جانے کی ذلت برداشت کر لے' تو اس کا نام صلح پسندی نہیں' بلکہ اس کے معنی ہیں ذلت قبول کر لینا' طاقت کے سامنے سر جھکا دینا۔ اسے صلح نہیں کہتے۔

یہ بالکل اسی طرح ہے جیسے آپ کسی بیابان سے گزر رہے ہوں اور وہاں ایک مسلح راہزن آپ کے سامنے آجائے اور کہے کہ فوراً گاڑی سے اتر جاؤ' ہاتھ اٹھا لو اور جو کچھ ہے میرے حوالے کر دو۔ آپ بھی ہتھیار ڈال دیں اور کہیں کہ میں کیونکہ صلح پسند انسان ہوں' جنگ و جدال کا قطعاً مخالف ہوں' تم جو کہو گے ماننے کو تیار ہوں' اپنا روپیہ پیسہ بھی تمہارے حوالے کرتا ہوں' سامان بھی تمہیں دیتا ہوں' گاڑی بھی دیتا ہوں' تم جو کچھ کہتے ہو ماننے کو تیار ہوں' جو چاہے مانگ لو تاکہ

تمہارے حوالے کردوں' کیونکہ میں صلح پسند آدمی ہوں۔

یہ صلح پسندی نہیں' بلکہ ذلت قبول کرنا ہے۔ اس مقام پر انسان کو حتی الامکان اپنا دفاع کرنا چاہئے۔ اپنے مال' اپنی عزت و آبرو کا تحفظ کرنا چاہئے۔ ماسوا یہ کہ اسے معلوم ہو کہ اگر اس نے اپنے دفاع کی کوشش کی تو اس کا مال و اسباب بھی برباد ہو گا اور اس کا خون بھی بہہ جائے گا' اور خون کی کوئی تاثیر بھی نہیں ہو گی۔ یعنی بعد میں بھی اس کا خون رائیگاں چلا جائے گا۔

البتہ ممکن ہے کہ ایک مرتبہ خون بہایا جائے اور بعد میں اس کا اثر ظاہر ہو' وہ بعد میں تاثیر رکھتا ہو' ایسا نہ ہو کہ ایک راہزن کے ہاتھوں اس کا خون بہے اور بس اس کی داستان ختم ہو جائے۔ ایسے موقع پر مقابلہ اور مزاحمت عاقلانہ بات نہیں' اس جگہ مال و دولت قربان کر کے جان بچا لینی چاہئے۔

پس صلح پسند ہونے اور ذلت قبول کرنے کے درمیان فرق ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں اسلام کسی صورت ذلت قبول کرنے کی اجازت نہیں دیتا لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ صلح کا طرفدار بھی ہے۔

ہماری مراد اس مسئلے کی اہمیت بیان کرنا ہے' جسے عیسائی اور غیر عیسائی اسلام کا ایک کمزور پہلو قرار دے کر اس پر تنقید و اعتراض کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی سیرت بھی یہی تھی۔ اسلام تلوار کا دین ہے۔ مسلمان لوگوں کے سروں پر تلوار تان کر ان سے کہتے ہیں کہ یا تو اسلام قبول کرو یا مرنے کے لئے تیار ہو جاؤ اور لوگ اپنی جان محفوظ رکھنے کی خاطر اسلام قبول کر لیتے ہیں۔ لہٰذا ہم اس موضوع کے بارے میں حتی الامکان تفصیل کے ساتھ گفتگو ضروری سمجھتے ہیں۔ اس دوران ہم آیاتِ قرآنی اور احادیث و سیرت نبوی کے مسلمات سے بھی استفادہ کریں گے۔ آیات قرآنی سے گفتگو شروع کرتے ہیں۔

جہاد کے بارے میں مطلق آیات

ہم عرض کر چکے ہیں کہ کفار کے خلاف جہاد کے حکم پر مشتمل بعض آیات مطلق ہیں۔ یعنی

صرف اتنا کہتی ہیں کہ: اے پیغمبر کفار اور منافقین کے خلاف جنگ کیجئے۔ یا مثلاً وہ سورہ جس کے بارے میں آیت کو ہم نے پہلے پڑھا ہے۔ مشرکین کو (چار ماہ) کی مہلت دینے کے بعد کہتی ہے کہ جب مہلت کے یہ چار مہینے گزر جائیں تو جہاں کہیں مشرکین کو دیکھو (کیا یہاں مکہ کے گرد و پیش اور حرم کی حدود مراد ہیں یا پوری دنیا میں کوئی بھی مقام؟ یہ وہ نکتہ ہے جس پر بعد میں بحث کی ضرورت ہے) اگر اس مدت کے بعد یہ لوگ اسلام قبول نہ کریں یا علاقہ نہ چھوڑ جائیں تو جہاں کہیں انہیں دیکھو انہیں مار ڈالو۔ یا وہی آیت جسے ہم نے (خطاب کی ابتدا میں) پڑھا ہے کہ: قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ لَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ لَا يُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَ لَا يَدِيْنُوْنَ دِيْنَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّ هُمْ صٰغِرُوْنَ (ان لوگوں سے قتال کرو جو خدا اور روزِ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے اور جس چیز کو خدا اور رسولِ خدا نے حرام قرار دیا ہے اسے حرام نہیں سمجھتے اور اہلِ کتاب ہوتے ہوئے بھی دینِ حق کی پابندی نہیں کرتے۔ یہاں تک کہ وہ اپنے ہاتھوں سے ذلت کے ساتھ تمہارے سامنے جزیہ پیش کرنے پر آمادہ ہو جائیں۔ سورہ توبہ ۹۔ آیت ۲۹) جو اہلِ کتاب کے بارے میں ہے۔ یا ایک دوسری آیت جو کہتی ہے کہ: يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ (اے پیغمبر! کفار اور منافقین سے جہاد کیجئے اور ان پر سختی کیجئے۔ سورہ توبہ ۹ آیت ۷۳)

خوب اگر ہم ہوتے اور قرآنِ کریم کی یہی چند آیات ہمارے سامنے ہوتیں تو ہم کہتے کہ کلی طور پر اسلام کا حکم یہ ہے کہ ہمیں کفار اور منافقین کے خلاف ہمیشہ حالتِ جنگ میں رہنا چاہئے اور ان کے ساتھ کسی صورت صلح کی حالت قائم نہیں ہو سکتی۔ ان سے جنگ کی جانی چاہئے۔ یا حتی الامکان ان سے جنگ کی جانی چاہئے۔ اگر ہم اس طرح کہیں تو ہمیں اس بات پر عقیدہ رکھنا ہوگا کہ قرآنِ مجید بغیر کسی شرط و قید کے کفار کے خلاف جنگ کا حکم دیتا ہے۔

مطلق کو مقید پر حمل کرنے کا قاعدہ

لیکن ہم نے عرض کیا کہ عرفی گفتگو کا ایک قاعدہ ہے اور وہ قاعدہ یہ ہے کہ اگر ہمارے پاس

کوئی مطلق اور مقید موجود ہو یعنی ایک مقام پر ایک حکم کا ذکر مطلق طور پر کیا گیا ہو اور دوسرے مقام پر مقید طور پر اس کا تذکرہ ہوا ہو تو علمِ اصول میں عرفی قاعدے کی رو سے کہتے ہیں کہ مطلق کو مقید پر حمل کرنا چاہیے۔

مذکورہ آیات بصورتِ مطلق ہیں جبکہ دوسری آیات ہیں جن میں مقید صورت میں ذکر ہوا ہے۔ یعنی یوں کہتی ہیں کہ: اے مسلمانو! ان کفار کے خلاف جنگ کرو کیونکہ انہوں نے تم پر جارحیت کی ہے کیونکہ وہ تمہارے ساتھ حالتِ جنگ میں ہیں۔ پس تم حتماً ان کے خلاف جنگ کرو۔ لہٰذا پتا چلتا ہے کہ جہاں یہ کہا گیا ہے کہ: یٰاَیُّهَا النَّبِیُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَ الْمُنٰفِقِیْنَ وَ اغْلُظْ عَلَیْهِمْ وہاں مراد یہ ہے کہ یہ کفار اور منافقین جو تمہارے ساتھ حالتِ جنگ میں ہیں تم بھی ان کے خلاف جنگ کرو جو تم سے حالتِ جنگ میں ہیں تم ان کے خلاف برسرِ پیکار ہو جاؤ۔

آیاتِ مقید

(سورۂ بقرہ میں ارشاد ہوتا ہے) فَقَاتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا اِنَّ اللّٰهَ لَا یُحِبُّ الْمُعْتَدِیْنَ (۱)۔ اے اہلِ ایمان ان لوگوں کے خلاف جنگ کرو جو تم سے لڑتے ہیں۔ یعنی کیونکہ وہ تمہارے خلاف نبرد آزما ہیں اس لئے ان سے لڑو۔ البتہ جن لوگوں کے خلاف لڑ رہے ہو اُن پر حد سے تجاوز نہ کرو۔ ان کے خلاف زیادتی کے مرتکب نہ ہو۔

''حد سے تجاوز نہ کرو'' سے کیا مراد ہے؟

اس کی تفسیر یہ ہے کہ جو لوگ تم سے لڑ رہے ہیں تم بھی فقط انہی سے لڑو اور میدانِ جنگ میں حساب برابر کرو۔ یعنی تم لوگ جن لوگوں سے لڑ رہے ہو۔ انہوں نے سپاہیوں کا ایک گروہ لڑنے کے لئے بھیجا ہے۔ ان کے پاس کچھ جنگجو ہیں اور یہ سپاہی تمہارے خلاف جنگ آزما ہیں

۱۔ جو لوگ تم سے جنگ کرتے ہیں تم بھی ان سے راہِ خدا میں جنگ کرو اور زیادتی نہ کرو کہ خدا زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ (سورۂ بقرہ ۲۔ آیت ۱۹۰)

تمھیں چاہئے کہ جو سپاہی تمہارے خلاف آمادۂ جنگ ہیں اُن سے لڑو۔ بقولے میدانِ جنگ میں حلوے مانڈے نہیں بٹتے' وہاں لڑائی بھڑائی ہی ہوتی ہے' وہاں جنگ کرو۔ لیکن وہ دوسرے لوگ جو جنگجو نہیں' جو سپاہی کی حیثیت سے تمہارے سامنے نہیں آتے' جیسے بوڑھے' بوڑھیاں بلکہ مطلق طور پر عورتیں چاہے وہ بوڑھی ہوں یا نہ ہوں اور بچوں پر ہاتھ نہ ڈالو' یا دوسرے اور اعمال جنہیں تجاوز یا حد سے گزرنا کہا جاتا ہے' اُن کے مرتکب نہ ہو۔ مثلاً درختوں کو نہ کاٹو' آبپاشی کی نالیوں کو بند نہ کرو۔ اس قسم کے اعمال سے اجتناب کرو' کیونکہ انہیں ''اعتداء'' یعنی تجاوز کہتے ہیں۔

غلط فہمی نہ ہو جائے' آپ یہ نہ کہنے لگیں کہ ممکن ہے کسی مقام پر ہمیں سپاہیوں سے لڑنا پڑے' اور ان کے مکانات کو تباہ کرنے کے سوا ہمارے پاس کوئی دوسرا راستہ موجود نہ ہو۔ ٹھیک ہے' ایسے مواقع پر جب یہ ان کے خلاف لڑنے کا مقدمہ ہو اور ایسا کیے بنا کوئی چارہ نہ ہو' تو معاملہ دوسرا ہے۔ لیکن اس عمل کا خود جنگی آپریشن کا حصہ ہونا ممنوع ہے۔ پس اس آیت میں وضاحت کے ساتھ کہا گیا ہے کہ: قَاتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَكُمْ (جو لوگ تم سے جنگ کرتے ہیں' تم بھی ان سے راہِ خدا میں جنگ کرو۔ سورۂ بقرہ ۲۔ آیت ۱۹۰)

دوسری آیت' وہ آیت ہے جسے ہم نے گزشتہ ہفتے آپ کی خدمت میں عرض کیا تھا۔ سورۂ حج کی یکے بعد دیگرے آنے والی پانچ چھے آیات تھیں۔ ان میں سے پہلی آیت جہاد کے بارے میں تھی۔ ان آیات کا مضمون بھی یہ تھا کہ کیونکہ وہ لوگ تم سے حالتِ جنگ میں ہیں اور کیونکہ ان لوگوں نے تمہارے اوپر تلوار تان لی ہے۔ لہٰذا تمہیں بھی اس بات کی اجازت ہے۔

ایک دوسری آیت میں جو سورۂ انفال یا سورۂ توبہ میں ہے' فرمایا گیا ہے کہ: وَقَاتِلُوا الْمُشْرِكِیْنَ كَآفَّةً كَمَا یُقَاتِلُوْنَكُمْ كَآفَّةً (اور تمام مشرکین سے اس طرح جنگ کرو جس طرح وہ تمہارے ساتھ جنگ کرتے ہیں۔ سورۂ توبہ ۹۔ آیت ۳۶)

مظلوم کی مدد کو پہنچنا

اس آیت اور دوسری آیت کے لیے آپ کی خدمت میں ایک تمہید عرض کرتا ہوں' اور وہ

یہ ہے کہ: ہم نے کہا کہ ممکن ہے جہاد کی اجازت مقید صورت میں ہو۔ کس چیز کی قید لگائی گئی ہو؟
ایک قید یہ ہے کہ مخالف فریق نے جارحیت کی ہو' اس نے تم پر حملہ کیا ہو اور کیونکہ وہ تمہارے
خلاف لڑ رہا ہے' لہٰذا تم اس سے جنگ کرو۔

کیا یہ قید بس اسی بات میں منحصر ہے کہ مخالف ہم سے جنگ کا ارادہ رکھتا ہو؟ یا نہیں ایک
دوسری چیز بھی ہے؟ اور وہ دوسری چیز یہ ہے کہ ممکن ہے کہ مخالف فریق ہم سے جنگ نہ چاہتا ہو
لیکن بعض انسانوں کے خلاف کھلم کھلا ظلم کا مرتکب ہوا ہو اور ہم ظلم کا شکار ہونے والے ان لوگوں کو
نجات دلانے کی قدرت رکھتے ہوں۔ اگر ہم انہیں نجات نہ دلائیں تو درحقیقت ہم نے ان
مظلوموں کے خلاف اس ظلم میں ظالم کی مدد کی ہے۔

جس جگہ ہم ہیں وہاں کسی نے ہم پر حملہ نہیں کیا ہے۔ لیکن کچھ اور لوگ جو ممکن ہے مسلمان
ہوں اور یہ بھی ممکن ہے کہ مسلمان نہ ہوں' اگر مسلمان ہوں تو جیسے کہ فلسطینیوں کا مسئلہ ہے کہ
اسرائیلیوں نے انہیں اُن کے گھروں سے بے دخل کر دیا ہے' ان کا مال و دولت لوٹ لیا ہے' ان
کے خلاف طرح طرح کے مظالم کا ارتکاب کرتے ہیں' لیکن کیونکہ فی الحال (اسرائیلی) ہم سے
کوئی سروکار نہیں رکھتے' تو کیا ایسی صورت میں اُن مظلوم مسلمانوں کو نجات دلانے کی خاطر اُن کی
مدد کو آگے بڑھنا ہمارے لئے جائز ہو گا؟

جی ہاں' یہ بھی جائز ہے' بلکہ واجب ہے۔ یہ جنگ کا آغاز کرنا نہیں ہے۔ یہ بھی ظالموں کے
ظلم سے نجات دلانے کی خاطر مظلوم کی مدد کو پہنچنا ہے' بالخصوص جبکہ وہ مظلوم مسلمان ہوں۔

جبر کے خلاف جنگ

لیکن اگر مظلوم غیر مسلم ہو' تو اس کی بھی دو صورتیں ہیں' ایک صورت یہ ہے کہ اس ظالم نے
لوگوں کو ایک ایسے حصار میں لے رکھا ہو جو ان تک اسلام کی دعوت پہنچنے میں مانع ہو۔ اسلام اپنے
آپ کو اس بات کا حقدار سمجھتا ہے کہ اپنی دعوت دنیا میں پھیلائے۔ لیکن اس کی دعوت پھیلنے کے
لئے' دعوت کو پھیلانے کی آزادی میسر ہونا چاہئے' تاکہ وہ جا کر اپنی دعوت کو پھیلا سکے۔

آپ ایک ایسی حکومت کو پیش نظر رکھئے جو لوگوں تک اسلام کی دعوت پہنچانے کے سلسلے میں مسلمانوں کے سامنے رکاوٹ حائل کرتی ہے۔ کہتی ہے کہ تمہیں اپنی بات کرنے کا حق نہیں، ہم تمہیں اس بات کی اجازت نہیں دیں گے۔ اس مقام پر عوام الناس سے جنگ جائز نہیں۔ عوام الناس کا کوئی گناہ ہی نہیں۔ عوام الناس بے خبر ہیں۔ لیکن کیا ایک ایسی گمراہ حکومت کے خلاف جنگ جائز ہے جس نے ایک فرسودہ عقیدے کو اپنی تکیہ گاہ (بنیاد) بنا رکھا ہو اور لوگوں کی گردنیں جکڑنے کے لئے اس سے ایک زنجیر کے طور پر استفادہ کرتی ہو اور ان لوگوں تک اسلام کی دعوت پہنچنے میں مانع ہو؟ کیا اُس قوم کے راستے سے یہ رکاوٹ دور کرنے کے لئے اس (حکومت) کے خلاف جنگ جائز ہے یا نہیں؟ اس گھٹن زدہ ماحول کے خلاف جنگ کرنا جائز ہے یا نہیں؟

اسلام کی نظر میں یہ بھی جائز ہے، کیونکہ یہ خود ظلم کے خلاف ایک قسم کی بغاوت ہے، چاہے بعض اوقات خود وہ مظلوم اس ظلم کی جانب متوجہ نہ ہو، اس نے (ظلم سے نجات کے لئے) تقاضا نہ کیا ہو، لیکن ضروری نہیں کہ تقاضا کیا جائے۔

کیا مدد کا تقاضا کرنا ضروری ہے؟

تقاضا کرنے (مدد طلب کرنے) کا مسئلہ بھی اپنی جگہ ایک مسئلہ ہے۔ آیا اگر مظلوم مدد کا تقاضا کرے تو کیا ہم پر اس کی مدد کرنا جائز یا واجب ہے؟ یا حتیٰ اگر وہ مدد کا تقاضا نہ بھی کرے تو کیا ہم پر جائز بلکہ واجب ہے؟

نہیں، یہاں یہ بات ضروری نہیں ہے کہ وہ مدد کا تقاضا کرے۔ لیکن صرف اتنا ہی ہو کہ وہ مظلوم واقعاً مظلوم ہو اور اس ظلم نے اس کی سعادت کی راہ میں کوئی رکاوٹ حائل کر دی ہو اور اُسے اس بات کی اجازت نہ ہو کہ اس دعوت سے آگاہ ہو جو ان لوگوں کی سعادت کا باعث ہے اور اگر وہ اس سے آگاہ ہوں تو وہ اسے قبول کر لیں گے، تو (ایسی صورت میں) اسلام کہتا ہے کہ اس رکاوٹ کو جو ایک حکومت کی شکل میں عوام الناس کے سامنے حائل ہے، اسے ہٹایا اور گرایا جا سکتا ہے۔

اسلام کے ابتدائی دور کی جنگیں

اسلام کے ابتدائی دور میں واقع ہونے والی بہت سی جنگیں اسی عنوان کے تحت تھیں۔ جنگ کی غرض سے لڑنے والے مسلمان کہتے تھے کہ ہماری جنگ عوام الناس سے نہیں ہے۔ بلکہ ہم حکومتوں کے خلاف لڑ رہے ہیں' تا کہ عوام الناس کو ذلت وخواری اور ان حکومتوں کی غلامی سے نجات دلائیں۔ (ایران کے) رستم فرخ زاد نے (اس سے لڑنے کے لئے آنے والے) عرب مسلمان سے پوچھا کہ تم کیا چاہتے ہو؟ اس مجاہد نے جواب دیا: لنخرج العباد من عبادة العباد الی عبادة اللّٰہ ۔ ہمارا مقصد یہ ہے کہ خدا کے بندوں کو جنہیں تم نے دھوکا وفریب اور قوت وطاقت کے بل بوتے پر اپنا غلام بنا رکھا ہے' تمہاری بندگی اور غلامی سے نجات دلائیں' انہیں آزادی دلائیں اور انہیں خدائے متعال اور خود اُن کے خالق کا بندہ بنائیں' نہ کہ انہیں ان ہی کی طرح کے لوگوں کی غلامی میں دیں۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اہلِ کتاب کے نام تحریر کئے گئے اپنے ایک خط میں خاص طور پر اس آیت کو جگہ دی کہ: قُلْ یٰٓاَھْلَ الْکِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰی کَلِمَۃٍ سَوَآءٍۭ بَیْنَنَا وَ بَیْنَکُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰہَ وَ لَا نُشْرِکَ بِہٖ شَیْئًا وَّ لَا یَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰہِ (۱) یعنی ان اہلِ کتاب سے کہو (یہ وہی اہلِ کتاب ہیں جن کے خلاف جنگ کا حکم آیا ہے) آؤ ایک کلمے پر یکجا ہو جائیں۔ یہ وہ کلمہ ہے جس کی نسبت ہمارے اور تمہارے درمیان مساوی ہے۔ یعنی ہم یہ نہیں کہہ رہے کہ وہ بات مان لو جو ہمارے نفع اور ہم سے تعلق رکھتی ہے بلکہ ہم کہہ رہے ہیں کہ ایک ایسی چیز قبول کر لو جو ہم سب کے فائدے اور ہم سب سے متعلق ہے۔

ایک مرتبہ ایسا ہوتا ہے کہ مثلاً ہم لوگوں سے کہتے ہیں کہ آؤ تم ہماری زبان قبول کر لو۔ اس

۱۔ آپ کہہ دیں کہ اے اہلِ کتاب! آؤ ایک منصفانہ کلمے پر اتفاق کر لیں کہ خدا کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں' کسی کو اس کا شریک نہ بنائیں' آپس میں ایک دوسرے کو خدائی کا درجہ نہ دیں۔ (سورۂ آلِ عمران ۳۔ آیت ۶۴)

صورت میں ان لوگوں کو یہ پوچھنے کا حق حاصل ہوتا ہے کہ ہم آپ کی زبان کیوں قبول کر لیں؟ ہمارے پاس اپنی زبان ہے' تمہارے پاس اپنی زبان' ہم کیوں تمہاری زبان قبول کریں۔ ہم کہتے ہیں کہ آیئے ہمارے مخصوص رسم ورواج اپنا لیجئے۔ ممکن ہے اس کے جواب میں وہ کہیں کہ ہم کیوں تمہاری رسم قبول کریں؟ ہم اپنی رسم کو مانتے ہیں۔

لیکن ایک موقع پر ہم دوسروں کو دعوت دیتے ہیں کہ آؤ ایک ایسی بات پر متفق ہو جائیں جو نہ ہماری ہے اور نہ تمہاری' بلکہ سب کی ہے۔ آؤ سب کے سب خدا کی ربوبیت کو قبول کریں۔ یہ تو صرف ہم سے متعلق نہیں ہے۔ اُس ذات کی عبادت کریں جو ہمارا بھی خالق ہے اور تمہارا بھی خالق ہے۔ اسے تم سے بھی وہی نسبت ہے جو ہم سے ہے۔ فرماتا ہے: تَعَالَوْا اِلٰی کَلِمَةٍ سَوَآءٍ بَیْنَنَا وَ بَیْنَکُم (آؤ اپنے مابین ایک منصفانہ کلمے پر اتفاق کر لیں) خدا کے سوا جو ہم سب کا خالق ہے کسی اور کی پرستش نہ کریں۔ ایک اور کلمہ جو ہمارے اور تمہارے دونوں کے لئے مساوی حیثیت رکھتا ہے وہ یہ ہے کہ: وَ لَا یَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ یعنی ہم میں سے بعض افراد بعض دوسروں کو اپنے لئے رب اور ارباب کے بطور منتخب نہ کریں۔ یعنی آقائی اور غلامی کا نظام ختم کردیں اور اس کی جگہ انسانوں کے درمیان باہمی مساوات کا قانون رائج کریں۔

یہ آیت اس بات کی وضاحت کرتی ہے کہ اگر ہم جنگ کرتے ہیں تو اس چیز کے لئے برسرِ جنگ ہوتے ہیں جو تمام افرادِ بشر کے لئے یکساں اور مساوی حیثیت رکھتی ہے۔

اس مقدمے کی روشنی میں یہ بات پتا چلتی ہے کہ ایک قید جو ہمارے مطلق کو مقید کر سکتی ہے' یہ ہے کہ اگر کچھ لوگ کسی قوم کے ظلم وستم کا شکار ہوں' تو انہیں اس ظلم وستم سے نجات دلانے کی خاطر جنگ کرنا جائز ہو جاتا ہے۔

اب ہم اس حوالے سے دو مزید آیات آپ کی خدمت میں پیش کرتے ہیں۔ سورۂ انفال کی آیت نمبر ۳۹ کہتی ہے کہ: وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰی لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّ يَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ (۱)

۱۔ اور تم لوگ اس وقت تک جنگ کرو جب تک فتنہ ختم نہ ہو جائے اور سارا دین صرف اللہ کے لئے رہ جائے۔

اُن کے خلاف جنگ کرو یہاں تک کہ فتنے کا خاتمہ ہو جائے۔

فتنے سے کیا مراد ہے؟

یعنی وہ لوگ جو تمہارے درمیان آ کے فتنہ پردازی کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ مسلمانوں کو ان کے دین سے خارج کریں ان سے جنگ کرو یہاں تک کہ یہ فتنہ ختم ہو جائے۔ یہ خود ایک قید ہے۔

سورۂ نسا کی آیت ۷۵ میں ایک اور قید کو بیان کیا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: وَ مَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُوْنَ فِىْ سَبِيْلِ اللهِ وَالْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَ النِّسَآءِ وَ الْوِلْدَانِ (۱) اے مسلمانو! تم خدا کی راہ میں اور مردوں اور عورتوں میں سے اُن لاچار لوگوں کے لئے، وہ بے چارے لوگ جو مشکلات میں مبتلا کر دیئے گئے ہیں، کیوں ان کے لئے، ان کو نجات دلانے کے لئے جنگ نہیں کرتے۔

مطلق کو مقید پر حمل کرنا

یہ پانچ آیات جنہیں ہم نے یہاں آپ کی خدمت میں پیش کیا، ان سے پتا چلتا ہے کہ جنگوں کے بارے میں اسلام کا حکم اگر بعض آیات میں مطلق ہے تو بعض دوسری آیات میں مقید ہے، اور ثابت شدہ عرفی اور اصولی قاعدے کی رو سے مطلق کو مقید پر حمل کرنا چاہئے۔

قرآنِ کریم میں ایک قسم کی آیات ایسی ہیں جو تصریح کرتی ہیں کہ دین کا فروغ دعوت کے ذریعے ہونا چاہئے زور زبردستی کے ذریعے نہیں۔ یہ نکتہ بھی اس بات کی تائید کرتا ہے کہ اسلام کا نظریہ یہ نہیں ہے کہ غیر مسلموں سے جبراً کہا جائے کہ یا تو مسلمان ہو جاؤ وگرنہ مار دیئے جاؤ گے۔ یہ آیات بھی ایک دوسرے انداز سے ان مطلق آیات کے مفہوم کو واضح کرتی ہیں۔

۱۔ اور آخر تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم اللہ کی راہ میں اور ان کمزور مردوں، عورتوں اور بچوں کے لئے جہاد نہیں کرتے ہو۔ (سورۂ نسا ۴۔ آیت ۷۵)

لا اکراہ فی الدین

ایک جملہ جو آیت الکرسی کا جز ہے اور بہت معروف جملہ ہے وہ یہ ہے کہ: لَآ اِکْـرَاہَ فِـی الدِّیْنِ قَـدْ تَبَیَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الغَیِّ (دین میں کسی طرح کا جبر نہیں ہے۔ ہدایت گمراہی سے الگ اور واضح ہو چکی ہے۔ سورۂ بقرہ۲۔ آیت ۲۵۶) یعنی آپ لوگوں کے لئے راہ راست کو واضح کر کے بیان کر دیجئے کہ حقیقت خود آشکارا ہے۔ دین کے معاملے میں کسی قسم کا اجبار' جبر اور زبردستی نہیں ہونی چاہئے۔ یعنی کسی کو دین اسلام اختیار کرنے پر مجبور نہ کرو۔ اس آیت میں مقصد کو نہایت وضاحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

تفاسیر میں لکھا ہے کہ انصار کا ایک شخص جو پہلے بت پرست تھا' اس کے دو بیٹے تھے جو عیسائی ہو گئے تھے۔ یہ دونوں بیٹے کٹر عیسائی تھے' جبکہ ان کا باپ مسلمان تھا اور اسے اپنے بیٹوں کے عیسائی ہونے کا انتہائی رنج تھا۔ ایک روز وہ شخص رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا: اے اللہ کے رسول! میں کیا کروں' میرے بچے عیسائی ہیں' میں نے ہر جتن کر کے دیکھ لیا لیکن وہ اسلام قبول نہیں کرتے۔ کیا آپ مجھے اس بات کی اجازت دیں گے کہ میں انہیں مجبور کروں کہ وہ اپنے دین سے دستبردار ہو کر مسلمان ہو جائیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: نہیں' لا اکراہ فی الدین۔

اس آیت کی شان نزول کے بارے میں یہ بھی تحریر کیا گیا ہے کہ: جیسا کہ آپ جانتے ہیں مدینہ میں دو قبیلے اوس اور خزرج رہا کرتے تھے۔ مدینہ کے اصل باشندے یہی لوگ تھے۔ ان کے ہمسائے میں یہودیوں کے چند بڑے قبائل رہا کرتے تھے۔ یہودیوں کے یہ بڑے قبائل بعد میں مدینہ میں آ کر مقیم ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک قبیلہ بنی نضیر تھا' ایک قبیلہ بنی قریظہ۔ یہودیوں کا ایک اور قبیلہ بھی تھا جو مدینہ کے نواح میں رہتا تھا۔

یہودی اس اعتبار سے کہ ان کا مذہب یہود تھا' ان کے پاس آسمانی کتاب تھی' ان لوگوں میں کم و بیش پڑھے لکھے لوگ موجود تھے مدینہ کے ان اصل باشندوں کے برعکس جو بت پرست اور

علم و دانش سے بے بہرہ تھے۔ (اُس دور میں) ابھی حال ہی میں ان کے درمیان بھی چند پڑھے لکھے لوگ پیدا ہو گئے تھے۔

یہودی کیونکہ علم و دانش میں ان سے بلند سطح پر تھے' اعلیٰ فکر کے حامل تھے' لہٰذا ان پر اثر رکھتے تھے۔ حالانکہ اوس اور خزرج کا مذہب یہودیوں کے مذہب سے جدا تھا' اس کے باوجود وہ یہودی عقائد کے زیر اثر ہو گئے اور بسا اوقات وہ اپنے بچوں کو پڑھنے لکھنے کے لئے یہودیوں کے پاس بھیج دیا کرتے تھے اور کبھی کبھار ایسا بھی ہوتا تھا کہ ان کے جو بچے یہودیوں کے پاس جاتے' وہ بت پرستی کے مذہب سے دستبردار ہو کر یہودی ہو جاتے تھے۔

جس وقت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مدینہ تشریف لائے' تو اہلِ مدینہ کے ان بچوں میں سے کچھ ان یہودیوں کے زیر تربیت تھے' نیز انہوں نے دین یہود اختیار کیا ہوا تھا اور ان میں سے چند دین یہود سے نہیں نکلے تھے۔ ان کے والدین مسلمان ہو چکے تھے لیکن ان کے بچے یہودیت چھوڑنے پر تیار نہ تھے۔ جب یہ قرار پایا کہ یہودی مدینہ کے اطراف سے چلے جائیں' یہ علاقہ چھوڑ دیں' تو یہ بچے بھی اپنے ہم مذہب لوگوں کے ساتھ چل دیئے۔ اس موقع پر ان بچوں کے باپ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ سے اجازت طلب کی کہ وہ اپنے بچوں کو ان یہودیوں سے علیحدہ کریں اور انہیں مجبور کریں کہ وہ دین یہود چھوڑ کر مسلمان ہو جائیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان لوگوں کو اس بات کی اجازت نہیں دی۔ ان لوگوں نے کہا کہ اے اللہ کے رسول! آپ ہمیں اجازت دیجئے کہ ہم انہیں بالجبر ان کے دین سے پلٹا کر مسلمان کر لیں۔ آپ نے فرمایا: نہیں' اب جبکہ ان لوگوں نے خود (اپنے لئے دین کا) انتخاب کیا ہے' انہیں انہی کے ساتھ جانے دو۔ کہتے ہیں کہ اس موقع پر یہ آیت نازل ہوئی کہ: لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ۔

دوسری آیت' وہ معروف آیت ہے کہ: اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَ الْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ (سورہ نحل ۱۶۔ آیت ۱۲۵) لوگوں کو اپنے

پروردگار کے راستے کی طرف بلایئے۔ کس طرح؟ طاقت سے؟ شمشیر سے؟ نہیں حکمت سے منطق سے دلیل سے اور اچھے انداز سے نصیحت سے۔ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ أَحْسَنُ۔ جو لوگ آپ سے مناظرہ کریں آپ بھی ان کے ساتھ اچھے انداز سے مناظرہ کیجئے۔ اس آیت میں بھی صاف الفاظ میں لوگوں کو اسلام کی طرف بلانے کا طریقہ ''دعوت'' بتایا گیا ہے۔

ایک دوسری آیت میں ارشاد ربانی ہے: وَ قُلِ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَ مَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ (۱) جس کسی کا دل چاہتا ہے کہ ایمان لائے' وہ ایمان لے آئے اور جس کا دل ایمان لانے پر تیار نہ ہو وہ کافر ہو جائے' کافرانہ زندگی بسر کرے۔ پس کیونکہ اس آیت میں بھی کہا گیا ہے کہ ایمان یا کفر اختیار کرنا اختیاری عمل ہے' لہٰذا اس میں جبر نہیں۔ پس اسلام نہیں کہتا کہ انہیں بالجبر دائرہ اسلام میں گھسیٹ لاؤ' اگر مسلمان ہو جائیں' تو ٹھیک ہے' وگرنہ انہیں مار ڈالو۔ (نہیں) اسلام کہتا ہے کہ انہیں اختیار حاصل ہے' جو کوئی مومن ہونا چاہتا ہے مومن ہو جائے اور جو ایمان لانے پر تیار نہیں وہ نہ لائے۔

ایک اور آیت ہے: وَ لَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَاٰمَنَ مَنْ فِي الْاَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِيْعًا اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰى يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ (۲) پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے خطاب ہے۔ آنحضرت کی انتہائی خواہش تھی کہ لوگ ایمان لے آئیں۔ قرآنِ مجید کہتا ہے کہ ایمان کے بارے میں جبر اور زبردستی درست نہیں۔ اگر جبر صحیح ہوتا تو خداوند عالم خود اپنے ارادہ تکوینی کے ذریعے تمام انسانوں کو مومن بنا سکتا تھا۔ لیکن ایمان ایک ایسا امر ہے جسے لوگوں کو اختیاری طور پر اپنانا چاہئے۔

پس جب خود خدا نے اپنے ارادہ تکوینی کے ذریعے اور بالجبر لوگوں کو مومن نہیں بنایا' بلکہ

۱۔ اور کہہ دو کہ حق تمہارے پروردگار کی طرف سے ہے' اب جس کا جی چاہے ایمان لے آئے اور جس کا دل کرے کافر ہو جائے۔ (سورۂ کہف ۱۸۔ آیت ۲۹)

۲۔ اور اگر خدا چاہتا تو روئے زمین پر رہنے والے سب لوگ ایمان لے آتے۔ تو کیا آپ لوگوں پر جبر کریں گے کہ سب مومن بن جائیں۔ (سورۂ یونس ۱۰۔ آیت ۹۹)

لوگوں کو آزاد اور خود مختار چھوڑا ہے' تو اے پیغمبر! آپ بھی لوگوں کو آزاد رہنے دیجئے' جس کا دل چاہے وہ ایمان لائے اور جس کا جی چاہے وہ ایمان نہ لائے۔

ایک اور آیت میں قرآن کریم پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے خطاب کرتے ہوئے فرماتا ہے: لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ اَلَّا يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ (۱) اے پیغمبر! کیا آپ ان لوگوں کے ایمان نہ لانے کی وجہ سے اپنے آپ کو مار ڈالیں گے' ان کے ایمان نہ لانے پر خود کو ہلاک کرلیں گے۔ ان کے بارے میں اس قدر غم نہ کھایئے۔ ہم اگر چاہیں تو اپنے تکوینی ارادے اور جبر سے انہیں مومن کردیں کیونکہ ہمارا راستہ کھلا ہوا اور آسان ہے: اِنْ نَّشَاْ نُنَزِّلْ عَلَيْهِمْ مِّنَ السَّمَآءِ اٰيَةً فَظَلَّتْ اَعْنَاقُهُمْ لَهَا خٰضِعِيْنَ (۲) ہم اگر چاہیں تو آسمان سے ایک آیت نازل کردیں' ایک عذاب نازل کردیں اور لوگوں سے کہیں کہ یا تو ایمان لے آؤ یا ہم تمہیں اس عذاب سے ہلاک کرتے ہیں۔ (اس طرح) تمام لوگ زبردستی ایمان لے آئیں گے۔ لیکن ہم یہ عمل انجام نہیں دیتے' کیونکہ ہم چاہتے ہیں کہ لوگ خود سے ایمان اختیار کریں۔

یہ آیات بھی جہاد کے بارے میں اسلام کے نکتۂ نظر کی وضاحت کرتی ہیں کہ اسلامی جہاد کا مقصد یہ نہیں ہے جس کا ڈھنڈورا بعض مفاد پرست پیٹتے ہیں کہ اسلام (کے جہاد) کا مقصد زور اور زبردستی (کے ذریعے لوگوں کو مسلمان بنانا) ہے اور وہ چاہتا ہے کہ جو بھی کافر ہو اس کے سر پر تلوار تان کر کہا جائے کہ یا تو اسلام اختیار کرو یا مرنے کے لئے تیار ہو جاؤ۔

صلح و آشتی

ایک اور قسم کی آیات بھی ہیں' ان کا بھی تذکرہ کرتے ہیں۔

۱۔ کیا آپ اپنے نفس کو (اس بات پر) ہلاکت میں ڈال دیں گے کہ یہ لوگ ایمان نہیں لارہے ہیں۔ (سورۂ شعراء ۲۶۔ آیت ۳)

۲۔ اگر ہم چاہتے تو آسمانوں سے ایسی آیت نازل کردیتے کہ ان کی گردنیں خضوع کے ساتھ جھک جاتیں۔ (سورۂ شعراء ۲۶۔ آیت ۴)

اسلام کلی طور پر صلح کو اہمیت دیتا ہے۔ ایک آیت میں وضاحت کرتا ہے کہ: وَالصُّلْحُ خَیْرٌ (صلح بہتر ہے۔ سورہ نساء ۴۔ آیت ۱۲۸) اور ہم پہلے عرض کر چکے ہیں کہ صلح اور چیز ہے اور ذلت، جبر اور گھٹنے ٹیک دینا علیحدہ بات۔ ایک آیت میں ارشاد ربانی ہے: یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِی السِّلْمِ کَآفَّۃً (۱) اس بنیاد پر کہ سلم سے مراد صلح ہو۔

لیکن اس سے بھی زیادہ واضح آیت یہ ہے: وَ اِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَھَا وَ تَوَکَّلْ عَلَی اللّٰہِ (۲) اے پیغمبر! اگر آپ کے مخالفین صلح کے طرفدار ہو جائیں اور صلح کی خاطر اپنے بازو پھیلا دیں، تو آپ بھی صلح پر تیار ہو جائیں۔ یعنی اگر وہ صلح طلب بن جائیں تو آپ بھی صلح طلب ہو جائیں۔

پس ان آیات سے بھی پتا چلتا ہے کہ اسلام کی روح صلح و آشتی کی روح ہے۔

ایک اور آیت میں ارشاد ہوتا ہے: فَاِنِ اعْتَزَلُوْکُمْ فَلَمْ یُقَاتِلُوْکُمْ وَ اَلْقَوْا اِلَیْکُمُ السَّلَمَ فَمَا جَعَلَ اللّٰہُ لَکُمْ عَلَیْھِمْ سَبِیْلًا (۳) اے پیغمبر! اگر وہ لوگ جنگ سے کنارہ کش ہو جائیں، اور آپ سے نہ لڑیں اور صلح کا اظہار کریں، اور کہیں کہ ہم آپ سے صلح پر تیار ہیں، تو خدا آپ کو اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ اس کے باوجود آپ آگے بڑھیں اور ان کے خلاف جنگ کریں۔

ایک اور مقام پر قرآن مجید منافقین کے بارے میں کہتا ہے کہ: فَاِنْ تَوَلَّوْا فَخُذُوْھُمْ وَاقْتُلُوْھُمْ حَیْثُ وَجَدْتُّمُوْھُمْ وَلَا تَتَّخِذُوْا مِنْھُمْ وَلِیًّا وَّلَا نَصِیْرًا۔ اِلَّا الَّذِیْنَ یَصِلُوْنَ اِلٰی قَوْمٍ بَیْنَکُمْ وَ بَیْنَھُمْ مِّیْثَاقٌ اَوْ جَآءُوْکُمْ حَصِرَتْ صُدُوْرُھُمْ اَنْ یُّقَاتِلُوْکُمْ اَوْ

۱۔ اے اہل ایمان تم سب کے سب صلح و آشتی میں داخل ہو جاؤ۔ (سورہ بقرہ ۲۔ آیت ۲۰۸)

۲۔ اگر وہ صلح کی طرف مائل ہوں تو تم بھی جھک جاؤ اور اللہ پر بھروسہ کرو۔ (سورہ انفال ۸۔ آیت ۶۱)

۳۔ اگر تم سے الگ رہیں اور جنگ نہ کریں اور صلح کا پیغام دیں، تو خدا نے تمہارے لئے ان کے اوپر کوئی راہ نہیں قرار دی ہے۔ (سورہ نساء ۴۔ آیت ۹۰)

يُقَاتِلُوا قَوْمَهُمْ (۱) وہ منافقین جو تم سے برسر پیکار ہیں اگر راہِ فرار اختیار کریں تو انہیں پکڑ لو اور جہاں کہیں پاؤ انہیں قتل کر دو۔ ان کے ساتھ دوستی نہ کرنا' ان سے مدد حاصل نہ کرنا' سوائے ان لوگوں کے جو ان لوگوں سے جا ملیں جن کے اور تمہارے درمیان معاہدہ ہے اور تمہارے ساتھ معاہدہ کرنے پر تیار ہوں' تو انہیں قتل نہ کرنا' یا وہ جو خود جنگ سے تنگ آئے ہوئے ہوں' تو ان سے بھی جنگ نہ کرنا۔

ہم نے یہاں چار قسم کی آیات کا تذکرہ کیا۔ ایک قسم کی آیات وہ تھیں جو مطلق طور پر کہتی ہیں کہ جنگ کرو۔ اگر ہم صرف ان آیات کو دیکھتے اور دوسری آیات ہمارے سامنے نہ ہوتیں تو ممکن تھا کہ ہم کہتے کہ اسلام جنگ و جدال کا دین ہے۔

دوسری قسم کی آیات وہ ہیں جو دوسروں کے خلاف جنگ کو کسی قید سے مقید کرتی ہیں۔ مثلاً یہ کہتی ہیں کہ وہ لوگ جو تمہارے خلاف حالتِ جنگ میں ہوں' یا یہ کہ انہوں نے کچھ مسلم یا غیر مسلم لوگوں کو اپنے قدموں تلے دبا کر رکھا ہوا ہو اور ان کی آزادی اور حقوق کو پامال کیا ہوا ہو (ان سے جنگ کرو)۔

تیسری قسم کی آیات وہ ہیں جو واضح طور پر کہتی ہیں کہ اسلامی دعوت بالجبر نہیں ہے۔

چوتھی قسم کی آیات وہ ہیں جن میں اسلام واضح طور پر اپنے صلح کا طرفدار اور حمایتی ہونے کا اعلان کرتا ہے۔

❁❁

۱۔ پھر اگر یہ انحراف کریں تو انہیں گرفتار کر لو اور جہاں پاؤ قتل کر دو اور خبردار ان میں سے کسی کو اپنا دوست اور مددگار نہ بنانا۔ علاوہ ان کے جو کسی ایسی قوم سے مل جائیں جن کے اور تمہارے درمیان معاہدہ ہو یا وہ تمہارے پاس دل تنگ ہو کر آجائیں کہ نہ تم سے جنگ کریں گے اور نہ اپنی قوم سے۔ (سورۂ نساء ۴۔ آیت ۸۹' ۹۰)

تیسرا خطاب

جہاد کی ماہیت دفاع ہے

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

"قَاتِلُوا الَّذِیۡنَ لَا یُؤۡمِنُوۡنَ بِاللّٰہِ وَ لَا بِالۡیَوۡمِ الۡاٰخِرِ وَ لَا یُحَرِّمُوۡنَ مَا حَرَّمَ اللّٰہُ وَ رَسُوۡلُہٗ وَ لَا یَدِیۡنُوۡنَ دِیۡنَ الۡحَقِّ مِنَ الَّذِیۡنَ اُوۡتُوا الۡکِتٰبَ حَتّٰی یُعۡطُوا الۡجِزۡیَۃَ عَنۡ یَّدٍ وَّ ہُمۡ صٰغِرُوۡنَ."

اس مقام پر ایک بحث یہ ہے کہ اسلام کی نظر میں جہاد کی ماہیت کیا ہے؟ جہاد کی حقیقت اور ماہیت کیا ہے؟

اس پہلو سے محققین کے درمیان کوئی اختلاف نہیں کہ جہاد کی ماہیت دفاع ہے۔ یعنی اس حوالے سے کسی کو شک وتردد نہیں کہ جارحیت کے طور پر کسی بھی قسم کا قتال اور جنگ یعنی دوسرے کے مال ودولت کو ہتھیانے کے لئے یا اس کی دوسری قوتوں پر قبضے کے لئے بالفاظ دیگر کسی قوم کی اقتصادی اور انسانی قوتوں کے استحصال کے لئے جنگ اسلام کی نظر میں کسی صورت جائز نہیں۔ اسلام کی رو سے اس طرح کی جنگیں ایک قسم کا ظلم ہیں۔

جہاد صرف دفاع کے طور پر ہے اور درحقیقت جارحیت سے اپنا دفاع کرنا ہے اور یہ جائز ہوسکتا ہے۔

البتہ ایک تیسری شق بھی ہے' جو نہ دوسرے کے مال و دولت اور اس کی قوتوں کو ہتھیانے اور ان کے استحصال (exploitation) کے لئے ہے اور نہ اپنے یا کسی انسانی قدر (value) کے دفاع کے لئے ہے' بلکہ ایک انسانی قدر کے فروغ اور اس کی توسیع کے لئے ہے' جس پر بعد میں گفتگو ہوگی۔

لہٰذا اس کلی کبریٰ میں کوئی اختلاف نہیں پایا جاتا کہ جہاد اور جنگ کو دفاع کے طور پر ہونا چاہئے۔ اختلاف صغروی بات میں ہے۔ یعنی اختلاف اس بات میں ہے کہ کس چیز کا دفاع کیا جائے؟

دفاع کی اقسام

اس مقام پر بعض لوگوں کا نکتۂ نظر محدود ہے' وہ کہتے ہیں کہ دفاع سے مراد ہے خود انسان کا اپنا دفاع کرنا۔ جنگ اس وقت قانوناً جائز ہے جب انسان بعنوان ایک فرد یا بعنوان ایک قوم و ملت اپنا اور اپنی زندگی کا دفاع کرنا چاہے۔

پس اگر ایک قوم یا ایک ملت کی زندگی کسی دوسرے کی طرف سے خطرے کا شکار ہو تو یہاں اس موقع پر اپنی زندگی کا دفاع مشروع (جائز) ہے۔ اسی طرح اگر اس کی دولت اور اس کی املاک حملے کی زد پر ہوں' تو اس صورت میں بھی حقوقِ انسانی کے نکتۂ نظر سے اسے اپنے دفاع کا حق حاصل ہے۔ لہٰذا اگر کسی فرد کے مال و دولت حملے کی زد پر ہوں تو اسے اپنے مال و دولت کے دفاع اور تحفظ کا حق حاصل ہے۔ یا اگر کوئی قوم کسی دوسری قوم کے مال و دولت پر تسلط حاصل کرنا چاہتی ہو' کسی طریقے سے اسے لوٹنا چاہتی ہو' تو اس قوم کو اپنے مال و دولت کے دفاع کا حق حاصل ہے' خواہ اس کے لئے اسے جنگ ہی کیوں نہ کرنا پڑے۔

اسلام کہتا ہے: المقتول دون اهله و عياله شهيد ۔ یعنی اگر کوئی شخص اپنے مال اور اپنی ناموس کا دفاع کرتے ہوئے مارا جائے' تو اسلام کی نظر میں وہ شہید ہے۔ پس اپنی ناموس کا دفاع بھی جان و مال کے دفاع کی مانند ہے' بلکہ اس سے بڑھ کر ہے' یہ اپنی عزت و آبرو کا دفاع

ہے۔ ایک قوم کی طرف سے اپنے استقلال (آزادی و خودمختاری) کا دفاع قطعاً ایک جائز امر ہے۔ پس اگر ایک قوم دوسری قوم کی خودمختاری کو چھیننا چاہتی ہو اور اسے اپنی قیمومیت (تسلط) میں لینا چاہتی ہو اور وہ قوم اپنی خودمختاری کا دفاع کرنا چاہے اور اس مقصد کے لئے اسلحہ اٹھائے' تو اس نے نہ صرف جائز بلکہ ایک قابلِ تحسین و تعریف عمل انجام دیا ہے۔

پس (اپنی) زندگی کا دفاع' (اپنے) مال و دولت اور سرزمین کا دفاع' (اپنی) خودمختاری کا دفاع' (اپنی) عزت و ناموس کا دفاع' یہ تمام دفاع مشروع (جائز) ہیں۔ ان مواقع پر دفاع کے جائز ہونے کے بارے میں کسی کو شک و تردد نہیں۔ لہٰذا وہ نکتۂ نظر جس کا بعض عیسائی اظہار کرتے ہیں کہ دین کو صلح کا طرفدار ہونا چاہئے' جنگ کا حامی نہیں اور جنگ مطلقاً بُری چیز ہے اور صلح و آشتی مطلقاً اچھی چیز ہے' ایک فضول بات ہے۔

ایک ایسی جنگ جو دفاع کی غرض سے ہو' نہ صرف بُری نہیں بلکہ بہت اچھی بات بھی ہے' انسانی حیات کی ضروریات میں سے ہے' اور قرآنِ کریم نے بھی اس امر کی وضاحت کی ہے کہ: وَلَوْ لَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّفَسَدَتِ الْاَرْضُ (اگر اسی طرح خدا بعض کو بعض کے ذریعے نہ روکتا رہتا تو ساری زمین میں فساد پھیل جاتا۔ سورۂ بقرہ ۲۔ آیت ۲۵۱)

یا ایک دوسرے مقام پر فرمایا ہے کہ: وَ لَوْ لَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَ بِيَعٌ وَّ صَلَوٰتٌ وَّ مَسٰجِدُ يُذْكَرُ فِيْهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِيْرًا (اگر خدا بعض لوگوں کے ذریعے بعض کو نہ روکتا تو تمام گرجے اور یہودیوں کی عبادت گاہیں اور مجوسیوں کے عبادت خانے اور مسجدیں جن میں کثرت کے ساتھ خدا کا نام لیا جاتا ہے منہدم کر دی جاتیں۔ سورۂ حج ۲۲۔ آیت ۴۰)

اس حد تک تو تقریباً سب ہی مانتے ہیں۔

حقوقِ انسانیت

یہاں ایک نکتہ ہے اور وہ یہ ہے کہ: وہ امر جس کا دفاع مشروع (جائز) ہے' کیا وہ صرف

یہی ہے کہ خود اس ایک فرد یا اس ملت کے حقوق پر آنچ آ رہی ہو؟ (کیا) صرف اسی میں منحصر ہے
یا وہ امور جن کا دفاع واجب ولازم ہے' ان میں بعض ایسے امور بھی شامل ہیں جو کسی ایک فرد یا کسی
خاص قوم کے حقوق کا حصہ نہیں ہیں' بلکہ حقوقِ انسانیت میں سے ہیں؟

پس اگر کسی موقع پر انسانیت کا کوئی حق حملے کی زد پر ہو' تو انسانیت کے اس حق کے دفاع
کے لئے جنگ کرنے کا حکم کیا ہے؟ کیا (ایسی جنگ) جائز ہے یا ناجائز؟

ممکن ہے کوئی پوچھے کہ حقوقِ انسانیت کے دفاع سے کیا مراد ہے؟ مجھے فقط اپنے انفرادی
حقوق کا دفاع کرنا چاہئے' یا زیادہ سے زیادہ اپنے ملی حقوق کا دفاع کرنا چاہئے۔ انسانیت کے
حقوق سے مجھے کیا سروکار۔ البتہ یہ نقطۂ نظر درست نہیں ہے۔

حقوقِ انسانی کا دفاع انفرادی اور قومی حقوق کے دفاع سے زیادہ مقدس ہے

بعض چیزیں ایسی ہیں جو ایک فرد یا ایک ملت کے حقوق سے زیادہ بڑھ کر ہیں' ان کے
زیادہ مقدس ہیں اور انفرادی حقوق کی نسبت ان کا دفاع انسانی وجدان کی نظر میں زیادہ بلند و برتر
ہے' اور یہ چیزیں انسانیت کے مقدسات ہیں۔۔ بالفاظ دیگر دفاع کے تقدس کی کسوٹی یہ نہیں ہے
کہ انسان کو اپنا دفاع کرنا چاہئے بلکہ کسوٹی یہ ہے کہ اسے "حق" کا دفاع کرنا چاہئے۔ جب کسوٹی
"حق" کا دفاع ہے' تو پھر انفرادی حق' عمومی حق اور انسانی حق کے درمیان کیا فرق ہے؟ بلکہ حقوقِ
انسانی کا دفاع زیادہ مقدس ہے اور آج چاہے اس کا نام نہ لیں لیکن عملاً اس کے معترف ہیں۔

مثلاً آزادی کو انسانیت کے مقدسات میں شمار کیا جاتا ہے۔ آزادی کا تعلق ایک فرد یا ایک
ملت سے نہیں ہے۔ اب اگر کہیں آزادی پر حملہ ہو' اور نہ وہ میری آزادی ہو اور نہ میری ملت کی
آزادی' بلکہ دنیا کے گوشوں میں سے کسی ایک گوشے میں اس آزادی پر حملہ کیا جائے جو تمام انسانوں
کے حقوق میں سے ایک حق ہے' تو کیا "انسانیت کے حق" کے دفاع کے طور پر انسانیت کے اس حق
کا دفاع جائز ہے یا نہیں؟ اگر جائز ہے' تو یہ دفاع صرف اس فرد تک محدود نہیں جس کی آزادی پر
حملہ کیا گیا ہے' بلکہ دوسرے لوگ اور دوسری اقوام بھی آزادی کی مدد کو آسکتی ہیں' بلکہ ان پر لازم ہے

کہ وہ آزادی کی مدد کو آئیں اور آزادی چھیننے اور گھٹن پیدا کرنے کے خلاف جنگ کریں۔

یہاں آپ کا جواب کیا ہوگا؟

میرے خیال میں کسی کو اس بات میں شبہ نہیں ہوگا کہ جہاد کی اقسام میں سے مقدس ترین جہاد جنگ کی اقسام میں سے مقدس ترین جنگ وہ جنگ ہے جو حقوق انسانیت کے دفاع کے لئے کی جائے۔

جس زمانے میں الجزائری عوام فرانسیسی استعمار کے خلاف برسرِ پیکار تھے تو بہت سے لوگوں نے حتیٰ یورپ سے تعلق رکھنے والے افراد نے بھی جنگجوؤں یا کسی دوسری حیثیت سے اس جنگ میں شرکت کی۔ کیا آپ کی نظر میں صرف الجزائریوں کا جنگ کرنا جائز تھا؟ کیونکہ خود ان کے حقوق پر حملہ ہوا تھا۔ پس اس بنیاد پر یورپ کے دور دراز علاقے سے آنے والا ایک شخص جو الجزائریوں کے حق کے دفاع میں اس جنگ میں شامل ہوا وہ ظالم اور جارح ہے اور اس سے کہنا چاہئے کہ تم اس جنگ میں شامل نہ ہو تم سے اس کا کیا تعلق؟ کسی نے تمہارے حق پر تو حملہ نہیں کیا' تم کیوں یہاں جنگ میں حصہ لے رہے ہو؟ یا وہ کہے کہ میں انسانیت کے حق کا دفاع کر رہا ہوں اور ایسے شخص کا جہاد اس الجزائری کے جہاد سے زیادہ مقدس ہے' کیونکہ الجزائری کا جہاد اپنے دفاع کا پہلو رکھتا ہے اور اس (یورپی شخص) کا عمل اس سے زیادہ اخلاقی قدر و قیمت کا حامل ہے اور اس سے زیادہ مقدس عمل ہے۔ یقیناً دوسری شق صحیح ہے۔

وہ حریت پسند افراد' جو یا تو حقیقتاً حریت پسند ہیں یا حریت پسند ہونا ظاہر کرتے ہیں اور لوگوں میں احترام کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں' انہیں یہ احترام اپنے اسی عمل کی وجہ سے حاصل ہے' کہ وہ اپنے آپ کو انسانیت کے حقوق کا محافظ قرار دیتے ہیں' نہ کہ خود اپنے انفرادی حقوق یا اپنی قوم کے حقوق یا اپنے براعظم کے حقوق کا محافظ۔ اور اگر کبھی یہ لوگ زبان و قلم' گفتگو اور خطاب اور شعور پیدا کرنے سے آگے بڑھ کر میدانِ جنگ میں داخل ہو جائیں' مثلاً فلسطینیوں اور ویت نامیوں کے حقوق کے طرفدار ہو جائیں' تو دنیا بہت زیادہ ان کا احترام کرتی ہے۔ ایسا نہیں ہوتا کہ

دنیا ان پر الزام لگائے' ان پر تنقید کرے' کہ تمہیں ان باتوں سے کیا؟ ان چیزوں کا تم سے کیا تعلق؟ تمہیں ان سے کیا مطلب؟!

مقدس ترین دفاع

دنیا کہتی ہے کہ جب بھی دفاع کے عنوان سے جنگ کی جائے' مقدس ہے۔ اگر اپنی ذات کا دفاع کیا جائے' تو مقدس ہے اور اگر اپنی قوم کا دفاع کیا جائے تو وہ اس سے زیادہ مقدس ہے کیونکہ ذاتی پہلو قومی پہلو میں تبدیل ہو جاتا ہے اور وسعت اختیار کر لیتا ہے اور اب انسان صرف اپنا دفاع نہیں کر رہا ہوتا بلکہ اپنی قوم کے دوسرے لوگوں کا بھی دفاع کر رہا ہوتا ہے۔ اور اگر قومی اور ملی حدود سے بڑھ کر انسانی حدود تک پہنچ جائے (یعنی اس کا مقصد اپنی قوم کا نہیں بلکہ انسانیت کا دفاع ہو) تو یہ عمل ایک اور درجہ بڑھ کر مقدس ہے۔

اختلاف صغروی ہے کبروی نہیں

یہ ہیں اس جملے کے معنی جسے ہم نے عرض کیا تھا کہ جہاد کے بارے میں دینی طلبا کی اصطلاح میں اختلاف کبروی نہیں ہے بلکہ صغروی ہے۔ یعنی اس بات میں اختلاف نہیں ہے کہ جہاد بعنوانِ دفاع جائز ہے' یا اگر دفاع میں نہ ہو تو بھی جائز ہے۔ اس کلی کبریٰ کے بارے میں کسی کو شک وشبہ نہیں ہے کہ جہاد صرف اور صرف دفاع کے طور پر جائز ہے لیکن بحث دفاع کے مصادیق کے بارے میں ہے۔ بحث اس مفہوم کے صغریٰ کے بارے میں ہے کہ دفاع کا مصداق کیا صرف انسان کا اپنی ذات کا دفاع ہے؟ زیادہ سے زیادہ اپنی قوم کا دفاع ہے؟ یا انسانیت کا دفاع بھی دفاع ہے؟

امر بالمعروف' حقوقِ انسانی کے دفاع کا مصداق ہے

کچھ لوگ کہتے ہیں' اور صحیح بھی کہتے ہیں کہ انسانیت کا دفاع بھی دفاع ہے۔ لہٰذا جو لوگ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے عنوان سے جدوجہد کرتے ہیں' ان کی یہ جدوجہد مقدس ہے۔

ممکن ہے کوئی ذاتی طور پر حملے کا نشانہ نہیں بنا ہو' انتہائی محترم اور صاحب عزت ہو' تمام وسائل و امکانات بھی اسے فراہم ہوں' قومی لحاظ سے بھی' یعنی قوم کے مادی حقوق پر بھی حملہ نہ ہوا ہو لیکن انسانی تصورات کے لحاظ سے کسی حق پر حملہ کیا گیا ہو۔ یعنی ایک ایسا معاشرہ جس میں وہ زندگی بسر کر رہا ہے' اس کے لوگوں کے مادی حقوق اور خود اس کے مادی حقوق حملے کی زد پر نہ ہوں' لیکن ایک ایسا مسئلہ جو انسانیت سے تعلق رکھتا ہے' یعنی جس کا تعلق انسانیت کے مفاد سے ہو' یعنی جہاں اچھائیاں اور برائیاں دو حصوں میں تقسیم ہوتی ہوں اور خوبیوں کا حصہ معاشرے میں برقرار ہونا چاہئے جبکہ برائیوں کو معاشرے سے ختم ہونا چاہئے۔ اب ان حالات میں' اس قسم کا آدمی اگر یہ دیکھے کہ معروفات کی جگہ منکرات نے لے لی ہے اور منکرات کی جگہ معروفات نے (اور وہ یہ دیکھ کر) امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے عنوان سے قیام کرے' تو وہ کس چیز کا دفاع کر رہا ہے؟ کیا اپنے ذاتی حق کا؟ نہیں' اپنے معاشرے کے حق کا' اپنی قوم کے مادی حق کے معنی میں؟ نہیں۔ (یہ دفاع) مادی حق سے تعلق نہیں رکھتا۔ ہاں' وہ ایک معنوی حق کا دفاع کر رہا ہے' جو کسی قوم اور ملت سے مخصوص نہیں ہے۔ یہ معنوی حق انسان سے تعلق رکھتا ہے۔ پس کیا ہمیں اس جہاد کی مذمت کرنی چاہئے' یا اسے مقدس شمار کرنا چاہئے؟ ہمیں اسے مقدس شمار کرنا چاہئے۔ کیونکہ یہ انسانوں کے حقوق کا دفاع ہے۔

آزادی کا دفاع آج بھی مقدس ہے

آزادی کے مسئلے میں' آپ دیکھتے ہیں کہ آج آزادی کے خلاف لڑنے والے تمام لوگ بھی' اپنے اس عمل کو جائز ظاہر کرنے کے لئے' کہتے ہیں کہ ہم آزادی کا دفاع کر رہے ہیں' کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ آزادی کا دفاع ایک مقدس مفہوم ہے۔

اگر جنگ واقعاً آزادی کے دفاع کے لئے ہو تو برحق ہے۔ لہٰذا وہ اپنی جارحیت کو آزادی کے دفاع کا نام دیتے ہیں۔ یہ اس بات کا اعتراف ہے کہ انسانیت کے حقوق بھی قابل دفاع ہیں۔ حقوق انسانیت کے لئے جنگ جائز اور مفید ہے۔

توحید ذاتی حق ہے یا اجتماعی حق؟

یہاں ایک مسئلے پر توجہ کی ضرورت ہے اور وہ مسئلہ یہ ہے کہ کیا توحید لا الہ الا اللہ حقوق انسانیت کا حصہ ہے یا یہ حقوقِ انسانیت میں شامل نہیں ہے؟

ممکن ہے کوئی یہ رائے دے اور کہے کہ توحید حقوقِ انسانیت کا جز نہیں ہے انسانوں کے نجی مسائل میں سے ہے یا زیادہ سے زیادہ قوموں کے ملی مسائل میں سے ہے۔ یعنی ممکن ہے میں موحد (توحید پرست) رہوں مجھے اختیار حاصل ہے کہ چاہے تو موحد رہوں چاہے تو مشرک۔ جب میں موحد ہو جاؤں تو کسی کو حق حاصل نہیں کہ وہ میرے مزاحم ہو کیونکہ یہ میرا ذاتی حق ہے۔ لیکن اگر کوئی دوسرا شخص مشرک ہو تب بھی کیا یہ اس کا ذاتی حق ہے؟

ایک قومی اکائی اپنے قوانین میں تین حالتیں رکھتی ہے۔ کبھی وہ اپنے رسمی مذہب کے طور پر توحید کا انتخاب کرتی ہے اور کسی غیر موحد شخص کو (اپنے حصے کے طور پر) قبول نہیں کرتی۔ کبھی کوئی قوم شرک کو اپنا رسمی مذہب قرار دیتی ہے اور کبھی آزادی دیتی ہے کہ جو کوئی جس طرح چاہے اپنی مرضی سے رہے۔

اگر توحید ایک قوم کے ملی قوانین کا جز ہو تو اس قوم کے حقوق کا حصہ ہے اور اگر ایسا نہ ہو تو نہیں۔ یہ ایک رائے ہے۔ لیکن یہاں ایک اور رائے بھی ہے اور وہ یہ ہے کہ توحید بھی آزادی کی مانند انسانی حقوق میں سے ہے۔ ہم نے عقیدے کی آزادی کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے عرض کیا تھا کہ آزادی کے حق کے معنی یہ نہیں ہیں کہ ایک فرد کی آزادی کو کسی دوسرے کی طرف سے کوئی خطرہ نہ ہو۔ بلکہ ممکن ہے خود اس کی اپنی طرف سے اسے خطرہ لاحق ہو۔ پس اگر کچھ لوگ توحید کے لئے اور شرک کے خلاف جنگ کریں تو ان کی جنگ دفاعی پہلو کی حامل ہے استحصالی استعماری استثماری اور جارحیت کے پہلو کی حامل نہیں۔

اب آپ صحیح طور پر سمجھ گئے ہوں گے کہ جس اختلاف کو ہم نے صغروی کہا ہے اس کے کیا معنی ہیں۔ اس مقام پر حتیٰ علمائے اسلام کے درمیان بھی دو آراء پائی جاتی ہیں۔ بعض حضرات

نے اس انداز سے اظہار نظر کیا ہے کہ ان کی رائے کا مفہوم یہ نکلتا ہے کہ توحید کا تعلق انسانوں کے اجتماعی حقوق سے ہے۔ پس توحید کی خاطر جنگ جائز ہے۔ کیونکہ یہ انسانیت کے حق کا دفاع کرنا ہے' یہ ایک دوسری قوم کو آزادی دلانے کی خاطر جنگ کرنے کی مانند ہے۔

لیکن ایک دوسرا گروہ ایک اور طرح سے اپنی رائے کا اظہار کرتا ہے' ان کی گفتگو کا مفہوم یہ ہے کہ توحید کا تعلق انفرادی حقوق یا قوموں کے ملی حقوق سے ہے' حقوق انسانی سے اس کا تعلق نہیں ہے۔ پس اس بنیاد پر کسی کو حق نہیں پہنچتا کہ وہ توحید کی خاطر کسی دوسرے فرد کے مزاحم ہو۔

ان میں سے کون سی رائے درست ہے؟

وہ امور جو قدرتی طور پر اجباری نہیں ہیں

اب ہم خود اپنی رائے عرض کرتے ہیں لیکن اپنی رائے کے اظہار سے پہلے ایک اور نکتے کا بیان ضروری سمجھتے ہیں کہ شاید یہ دونوں نظریے نتیجے کے لحاظ سے ایک ہو جائیں' اور وہ نکتہ یہ ہے کہ بعض مسائل میں جبر و اکراہ کیا جا سکتا ہے لیکن بعض دوسرے مسائل از خود فی نفسہ جبر و اکراہ کے قابل نہیں ہوتے' ان کی طبیعت (nature) یہ ہے کہ انہیں اختیاری ہونا چاہئے۔

مثلاً فرض کیجئے ایک خطرناک بیماری ہو جاتی ہے' چاہتے ہیں کہ اس کے لئے لوگوں کو ٹیکے لگائیں' اس مقام پر لوگوں کو ٹیکے لگوانے کے لئے مجبور کیا جا سکتا ہے۔ حتیٰ اگر کوئی اس پر تیار نہ ہو' تو آئیں زبردستی اس کے ہاتھ پاؤں باندھیں اور کتنا ہی وہ ہاتھ پاؤں مارے لیکن بے ہوشی کی حالت میں اس کے ٹیکہ لگا دیں۔ یہ ایسا کام ہے جو بالجبر کیا جا سکتا ہے۔ لیکن بعض چیزیں ایسی ہیں جن میں جبر نہیں کیا جا سکتا' یہ اختیار اور انتخاب کے سوا کسی اور طریقے سے ممکن نہیں ہیں۔ مثلاً تزکیۂ نفس اور تربیت عالی اس قسم سے ہیں۔ اگر ہم عالی انداز سے لوگوں کی تربیت کرنا چاہیں' یعنی اس انداز سے تربیت کریں کہ یہ لوگ فضیلت کو ایک فضیلت کے عنوان سے قبول کریں' اس کا انتخاب کریں اور برائیوں سے اس عنوان سے اجتناب کریں کہ وہ برائی ہے' انسانیت میں نقص ہے۔ یعنی انہیں جھوٹ سے نفرت ہو اور سچائی کے لئے احترام اور اہمیت کے قائل ہوں۔ یہ کام

تازیانوں کے زور پر نہیں ہو سکتا۔

تربیت میں جبر نہیں ہو سکتا

تازیانے کے زور پر کسی کو چوری سے باز رکھنا تو ممکن ہے' لیکن تازیانے کے زور پر کسی کی روح میں امانتداری پیدا نہیں کی جاسکتی اور اگر ایسا ہوتا تو جس شخص کو تہذیب نفس اور اعلیٰ اخلاق سے آراستہ کیا جانا مقصود ہوتا' اُسے لیجا کر ایک سو تازیانے مارتے اور اس کی اعلیٰ تربیت ہو جاتی۔ یعنی تربیت کے لئے تمام چیزوں کو چھوڑ کر فقط تازیانے مارتے اور کہتے کہ یہ شخص عمر بھر کبھی جھوٹ نہ بولے اور اسے جھوٹ بولنا برا محسوس ہو' اس مقصد کے لئے اسے ایک سو تازیانے لگاؤ کیونکہ تازیانے کھانے کے بعد اسے جھوٹ بولنے سے نفرت ہو جائے گی۔

اسی طرح کسی کو پسند کرنا بھی ہے۔ کیا کسی کو تازیانے مار کر کسی سے محبت پر مجبور کیا جاسکتا ہے؟ جبراً کسی سے محبت نہیں کرائی جاسکتی۔

مذکورہ امور وہ ہیں جن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ یہ جبر قبول نہیں کرتے۔ اگر دنیا کی تمام قوتیں جمع کر کے ان کے ذریعے کسی کے دل میں کسی کی محبت بٹھانا چاہیں' یا کسی کے دل سے کسی کی محبت نکالنا چاہیں' تو ایسا ممکن نہیں ہے۔

ایمان میں جبر نہیں ہے

اب جبکہ آپ یہ نکتہ جان چکے ہیں' ہم عرض کرتے ہیں کہ ایمان' قطع نظر اس کے کہ یہ حقوقِ انسانی میں سے ہے یا نہیں' اس میں طبیعتاً زور اور زبردستی ممکن نہیں۔ بالفرض ہم چاہتے ہوں کہ طاقت کے ذریعے ایمان پیدا کریں' تو خود ایمان کی خاصیت یہ ہے کہ وہ بالجبر پیدا نہیں کیا جاسکتا۔

ایمان' یعنی عقیدہ اور یقین۔ ایمان یعنی ایک فکر میں جذب ہونا اور ایک فکر کو قبول کرنا۔ کسی فکر میں مجذوب ہونے کے لئے دو رکن ہوتے ہیں۔ اس کا ایک رکن اس بات کا علمی پہلو ہوتا

ہے جسے انسان کی فکر اور عقل قبول کرے جبکہ اس کا دوسرا رکن اس کا احساساتی پہلو ہوتا ہے کہ انسان کا قلبی رجحان (اس جانب) ہو۔ ان میں سے کوئی ایک بھی جبر، زور اور زبردستی کے دائرے میں نہیں آتا۔ نہ اس کا فکری پہلو، کیونکہ فکر منطق کی تابع ہے۔ اگر ایک بچے کو ریاضی کا کوئی مسئلہ سکھانا چاہیں، تو اسے منطق کے ذریعے سکھائیں گے، تاکہ وہ اس پر عقیدہ پیدا کرے۔ اسے تازیانے مار کر نہیں سکھایا جا سکتا۔ یعنی مار کھا کر وہ اس فکر کو قبول نہیں کرتا اور یقین اور احساسات اور محبت کا پہلو بھی اسی طرح ہے۔

آزادی بالجبر دی جاسکتی ہے لیکن ایمان، آزادگی اور حریت پسندی نہیں

لہٰذا توحید {چاہے اسے ہم انسانوں کے حقوق میں سے سمجھیں} اور اسکے علاوہ مثلاً آزادی کے درمیان یہ فرق موجود ہے۔ آزادی لوگوں کو قوت کے ذریعے فراہم کی جاسکتی ہے کیونکہ جارح کو قوت کے ذریعے روکا جاسکتا ہے۔ طبعاً یہ لوگ آزاد ہیں۔ پس کسی قوم کو قوت کے ذریعے آزاد کرایا جاسکتا ہے، کیونکہ قوت کے بل پر جارح کو روکا جاسکتا ہے۔ لیکن آزادی اور حریت پسندی کی روح کو بزور مسلط نہیں کیا جاسکتا۔ کسی کے دل میں کسی چیز پر ایمان اور عقیدے کو بالجبر پیدا نہیں کیا جاسکتا۔ یہی اس آیت: لَآ اِكْرَاهَ فِى الدِّيْنِ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَىِّ (۱) کے معنی ہیں۔

یہ جو قرآن کریم کہتا ہے کہ دین میں جبر نہیں ہے، اس کے ذریعے وہ یہ نہیں کہنا چاہتا کہ دین کو بالجبر مسلط کیا جاسکتا ہے، اور باوجودیکہ دین کو بالجبر مسلط کیا جاسکتا ہے، تم اسے مسلط نہ کرو، لوگوں کو چھوڑ دو کہ وہ بغیر کسی جبر کے دیندار بنیں۔ بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ دین کو جبراً اور قوتاً مسلط نہیں کیا جاسکتا۔ جو چیز بالجبر مسلط ہو جائے وہ دین نہیں ہے۔

قرآن کریم اُن عرب بدوؤں کے اس گروہ کے دعوے کے جواب میں، جنہوں نے ابھی نیا نیا اسلام قبول کیا تھا، اور اسلام کی حقیقت کو سمجھے بغیر اور بنا اس کے کہ اسلام نے ان کے دلوں

۱۔ دین میں کسی طرح کا جبر نہیں ہے۔ ہدایت گمراہی سے الگ اور واضح ہو چکی ہے۔ (سورہ بقرہ ۲۔ آیت ۲۵۶)

میں کوئی نفوذ پیدا کیا ہو؟ آ کے ایمان کا دعویٰ کر رہے تھے' کہتا ہے: قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَ لٰكِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا وَ لَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ (۱) قرآن کی اصطلاح میں اعراب سے مراد بادیہ نشین ہیں۔ بادیہ نشین آتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے ہیں' ان سے کہئے کہ تم ایمان نہیں لائے ہو' تم کہو' "اَسْلَمْنَا" ہم اسلام لائے ہیں۔ یعنی یہ کہو کہ ہم نے اسلام کا زبانی اعتراف کیا ہے۔ ہم نے ایک ایسا عمل انجام دیا ہے' جس کے نتیجے میں ہم ایک مسلمان کا ظاہری حکم رکھتے ہیں۔ یعنی ہم نے شہادتین (کلمے) کو زبان پر جاری کیا ہے' پس ہم مسلم معاشرے کا حصہ بن گئے ہیں اور اب ہمارے حقوق دوسرے مسلمانوں کے حقوق کے برابر ہیں۔ لیکن وہ چیز جسے ایمان کہا جاتا ہے' تمہارے اندر پیدا نہیں ہوئی ہے: وَ لَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ۔ ابھی ایمان نے تمہارے دل کی گہرائیوں میں جگہ نہیں بنائی ہے۔ (یوں قرآن کریم) کہنا چاہتا ہے کہ ایمان کا تعلق دل سے ہے۔

اپنے دعوے کے لئے ہمارے پاس دوسرا مؤید یہ ہے کہ اسلام اصولِ دین میں تقلید کو جائز نہیں سمجھتا اور حتماً تحقیق کو لازم قرار دیتا ہے۔ اصولِ دین عقیدے اور ایمان سے تعلق رکھتے ہیں۔ پس پتا چلتا ہے کہ اسلام کا نظریہ یہ ہے کہ ایمان کو آزادانہ سوچ کے ذریعے حاصل کیا جائے۔ غیر آزادانہ سوچ کے ذریعے' چاہے تقلید کی قید کے ذریعے ہو' یا جبر و قوت کے زور پر' اسلام کا مطلوب عقیدہ اور ایمان حاصل نہیں ہوتا۔

اب جب ہم نے اس نکتے کو سمجھ لیا ہے' ہم دیکھتے ہیں کہ اسلامی محققین کے وہ دو نظریے یہاں ایک دوسرے کے قریب آ جاتے ہیں۔ ایک گروہ کا نظریہ یہ تھا کہ توحید حقوقِ انسانیت کا حصہ ہے اور جو چیزیں بھی حقوقِ انسانیت ہوں ان کا دفاع کیا جا سکتا ہے۔ لہٰذا توحید کا بھی دفاع

۱۔ یہ بدو عرب کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے ہیں تو آپ کہہ دیجئے کہ تم ایمان نہیں لائے بلکہ یہ کہو کہ اسلام لائے ہیں کہ ایمان ابھی تمہارے دلوں میں داخل نہیں ہوا ہے۔ (سورۂ حجرات ۴۹۔ آیت ۱۴)

کیا جا سکتا ہے۔ پس کسی قوم سے توحید کی خاطر لڑا جا سکتا ہے۔ جبکہ دوسرا گروہ جو نظریہ رکھتا ہے' اُن کے قول سے مراد یہ ہے کہ نہ صرف توحید کی خاطر جنگ نہیں کی جا سکتی' بلکہ اگر کوئی قوم مشرک ہو تو اس سے بھی جنگ نہیں کی جا سکتی۔

ایمان اور توحید کی راہ میں حائل رکاوٹوں کے خلاف جنگ

اس گفتگو کی رو سے' جسے ہم نے پیش کیا' یہ دو بیانات باہم قریب قریب ہو سکتے ہیں۔ کیونکہ اگر ہم توحید کو انسانی حقوق میں سے بھی سمجھیں' تب بھی دوسری قوم سے اس پر عقیدۂ توحید مسلط کرنے کی خاطر جنگ نہیں کر سکتے' کیونکہ یہ عقیدہ خود قابلِ تسلط نہیں ہے۔ ہاں' ایک اور چیز ہے اور وہ یہ ہے کہ اگر ہم توحید کو انسانوں کے حقوق کا حصہ سمجھتے ہوں' تو ممکن ہے اگر انسانیت کی مصلحت تقاضا کرے اور اگر توحید کی مصلحت کا تقاضا ہو' تو ہم کسی مشرک قوم کے خلاف جنگ کر سکتے ہیں۔ البتہ اس لئے نہیں کہ ان پر توحید کو مسلط کریں اور انہیں ایمان لانے پر مجبور کریں۔ کیونکہ توحید اور ایمان کو بالجبر مسلط نہیں کیا جا سکتا۔

ہم فساد کو جڑ سے کاٹ ڈالنے کی خاطر مشرکین سے جنگ کر سکتے ہیں۔ قوت کے ذریعے عقیدۂ شرک کے سرچشمے کو جڑ سے ختم کر ڈالنا ایک چیز ہے اور عقیدۂ توحید کو مسلط کرنا دوسری چیز۔ (دونوں علیحدہ علیحدہ باتیں ہیں)

جو لوگ توحید کو ذاتی حقوق اور زیادہ سے زیادہ قومی حقوق میں سے سمجھتے ہیں' اُن کے نکتۂ نظر سے یہ عمل جائز نہیں۔ اہلِ یورپ کی اکثریت کا یہی طرزِ تفکر ہے' جو ہمارے درمیان بھی سرایت کر گیا ہے۔

اہلِ یورپ کی نظر میں اس قسم کے مسائل نجی اور زندگی کے غیر سنجیدہ مسائل ہیں۔ تقریباً ان رسوم (traditions) کی مانند ہیں جن کے بارے میں ہر قوم کو حق ہوتا ہے کہ جس رسم کو چاہے اپنائے' منتخب کرے۔ پس' چاہے فساد کی جڑ کاٹنے کے لئے ہو' تب بھی (اُن کے بقول) ہم شرک کے خلاف جنگ کا حق نہیں رکھتے۔ کیونکہ شرک فساد نہیں ہے اور توحید ایک نجی (Personal)

اور ذاتی مسئلہ ہے۔

لیکن اگر ہم توحید کو ایک اجتماعی مسئلہ انسانی حقوق کا حصہ اور عام انسانوں کی سعادت کی شرائط میں سے سمجھیں، تو مشرک کے ساتھ جنگ ابتدائی (یعنی حملہ) توحید کی حفاظت، توحید کے دفاع اور فساد کی جڑ کاٹنے کے عنوان سے جائز ہے۔ حالانکہ یہ عقیدۂ توحید کو مسلط کرنے کے عنوان سے جائز نہیں ہے۔

دعوت کی آزادی اور تبلیغ کی رکاوٹیں دور کرنے کے لئے جنگ

اب اس مقام سے ہم ایک دوسری بحث میں داخل ہوتے ہیں اور وہ بحث یہ ہے کہ کیا دعوت کی آزادی کے لئے جنگ کرنا جائز ہے یا جائز نہیں ہے؟

دعوت کی آزادی کے لئے جنگ کرنے سے کیا مراد ہے؟

یعنی ہم کہتے ہیں کہ ہمیں ہر قوم میں ایک خاص فکر اور عقیدے کی تبلیغ کے لئے آزاد ہونا چاہئے، تبلیغ سے مراد آج کی تبلیغ نہیں ہے جو پروپیگنڈہ کرنا ہے۔ بلکہ مراد یہ ہے کہ (اپنا نظریہ) بیان کریں۔ چاہے اس عنوان سے کہ ہم آزادی کو ایک اجتماعی اور انسانی حق سمجھتے ہوں، چاہے اس عنوان سے کہ توحید کو ایک عمومی انسانی حق مانتے ہوں، یا اس عنوان سے کہ ان دونوں ہی کو ایک عمومی انسانی حق سمجھتے ہوں، یہ امر جائز ہے۔

اب اگر ہماری دعوت کی راہ میں کوئی رکاوٹ پیدا ہو جائے۔ ہم دیکھیں کہ ایک طاقت (حکومت) آکر رکاوٹ بنتی ہے اور کہتی ہے کہ ہم تمہیں اجازت نہیں دیتے، تم ان لوگوں کے افکار کو خراب کرنا چاہتے ہو۔

آپ جانتے ہیں کہ اکثر حکومتیں اس فکر کو خراب فکر قرار دیتی ہیں جو اگر لوگوں میں پیدا ہو جائے تو پھر لوگ ان حکومتوں کے مطیع و فرمانبردار نہ رہیں۔

وہ حکومتیں جو قوموں کے درمیان دعوت کی نشر و اشاعت میں رکاوٹ ہیں، انہیں ختم کرنے اور دعوت کی راہ میں حائل رکاوٹ دور کرنے کے لئے، یا ان حکومتوں کے خلاف جنگ جائز ہے یا

نہیں ناجائز ہے؟

جی ہاں یہ بھی جائز ہے۔ یہ بھی دفاعی پہلو کا حامل عمل ہے۔ یہ بھی ان جہادوں میں سے ہے جن کی ماہیت درحقیقت دفاع ہے۔

انفرادی اور اجتماعی حقوق کا پیمانہ

یہاں تک ہم نے جہاد کی ماہیت کی وضاحت کی ہے۔ صرف ایک مسئلہ باقی رہ گیا ہے اور وہ یہ ہے کہ کیا ہماری نظر میں توحید کا شمار انسانوں کے اجتماعی حقوق میں ہوتا ہے' یا ہم اسے ان کے انفرادی حقوق میں سے سمجھتے ہیں' یا توحید زیادہ سے زیادہ ان کے قومی حقوق سے تعلق رکھتی ہے۔

یہاں ہمیں یہ دیکھنا چاہئے کہ اجتماعی حقوق انسانی اور انفرادی اور نجی حقوق انسانی کا پیمانہ کیا ہے۔ انسان بعض مسائل میں باہم مشترک ہیں۔ روئے زمین پر زندگی گزارنے والے تمام انسان بہت سی چیزوں میں ایک دوسرے کی مانند ہیں' اور بہت سی چیزوں میں ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ فرق اس قدر زیادہ ہیں کہ حتیٰ دو افراد بھی ایسے تلاش نہیں کیے جا سکتے جو ہر پہلو سے ایک دوسرے کی مانند ہوں' اسی طرح جیسے دو افراد جسم اور شکل وصورت کے لحاظ سے سو فیصد ایک دوسرے کی مانند نہیں ہو سکتے۔ آپ دو افراد بھی ایسے نہیں لا سکتے جو روحانی خصوصیات کے لحاظ سے سو فیصد ایک دوسرے کی طرح ہوں۔

وہ مصلحتیں جو انسانوں کے مشترک پہلوؤں سے تعلق رکھتی ہیں' وہ ان کے اجتماعی حقوق ہیں۔ آزادی' یعنی بشر کی کلی صلاحیتوں کے اظہار میں کوئی رکاوٹ حائل نہ ہو' اس کا تعلق تمام انسانوں سے ہے۔ آزادی میرے لئے بھی اسی قدر اہمیت کی حامل ہے' جتنی آپ کے لئے اہمیت رکھتی ہے' اور آپ کے لئے بھی اسی قدر اہمیت رکھتی ہے' جس قدر دوسروں کے لئے اہمیت کی حامل ہے۔ لیکن میں اور آپ بہت ساری چیزوں میں ایک دوسرے سے مختلف ہیں اور اس کا نام ہم ''سلیقہ'' رکھتے ہیں' کیونکہ یہ شخصی اختلافات ہیں۔

جس طرح ہماری رنگت اور شکل وصورت ایک دوسرے سے مختلف ہوتی ہے' اسی طرح

ہمارے سلیقے بھی مختلف ہوتے ہیں۔ میں اپنے لباس کے لئے ایک رنگ پسند کرتا ہوں اور آپ کوئی دوسرا رنگ' مجھے لباس کی بناوٹ کے لحاظ سے ایک طرح کا لباس پسند ہے' جبکہ آپ دوسرے انداز کی بناوٹ کا لباس پسند کرتے ہیں' مجھے رہنے کے لئے ایک شہر پسند ہے آپ کو کوئی دوسرا شہر' میں ایک جگہ کو پسند کرتا ہوں آپ دوسری جگہ کو' میں اپنے کمرے کو ایک انداز سے سجاتا ہوں آپ دوسرے انداز سے' میں حصول علم کے لئے ایک شعبے کا انتخاب کرتا ہوں آپ دوسرے شعبے کو منتخب کرتے ہیں۔ یہ شخصی اور نجی مسائل ہیں۔

شخصی اور نجی مسائل میں ایک فرد کو دوسرے فرد کے مزاحم نہیں ہونا چاہئے۔ لہذا کسی کو یہ حق نہیں کہ شریکِ حیات کے انتخاب کے سلسلے میں کسی دوسرے فرد کو مجبور کرے' کیونکہ اس کا شمار انسان کے نجی مسائل میں ہوتا ہے۔ ہر کوئی سلیقے کے اعتبار سے شریکِ حیات کے انتخاب میں ایک مخصوص سلیقہ رکھتا ہے۔ اسلام بھی کہتا ہے کہ شریکِ حیات کے انتخاب کے سلسلے میں کسی کو مجبور نہ کیا جائے' کیونکہ یہ نجی مسائل میں سے ہے۔

اہلِ یورپ جو یہ کہتے ہیں کہ توحید اور ایمان کے لحاظ سے کسی کے مزاحم نہیں ہونا چاہئے' اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کا خیال ہے کہ یہ نجی' سلیقے کے' ذوقی اور فردی و شخصی امور میں سے ہے۔ انسان کے لئے ضروری ہے کہ وہ زندگی میں ایک چیز سے تعلق رکھے' اس چیز کا نام ایمان ہے۔ یہ فنی امور کی مانند ہے' ایک شخص کو "حافظ" پسند ہے' دوسرا سعدی کو پسند کرتا ہے' ایک اور ہے جسے مولانا روم پسند ہیں' ایک کو خیام پسند آتا ہے' ایک اور کو فردوسی پسند ہے۔ اب کسی کو اس فرد کے مزاحم نہیں ہونا چاہئے جو سعدی کو پسند کرتا ہے' کہ تم سعدی کو کیوں پسند کرتے ہو؟ مجھے حافظ پسند ہے' تمہیں بھی لازماً حافظ ہی کو پسند کرنا چاہئے۔ وہ کہتے ہیں کہ دین بھی اسی طرح ہے۔ ایک شخص اسلام کو پسند کرتا ہے' ایک عیسائیت کو اور ایک اور زرتشتیت کو' جبکہ ایک اور ہے جسے ان میں سے کوئی بھی پسند نہیں۔ ہمیں کسی کے مزاحم نہیں ہونا چاہئے۔

یہ چیزیں اہلِ یورپ کی نظر میں زندگی کی بنیاد سے تعلق نہیں رکھتیں۔ انسان کی راہ حیات

سے مربوط نہیں۔ یہ لوگ دراصل دین کے بارے میں اپنے طرز تفکر اور طرز تصور میں ہمارے طرز تصور سے مختلف ہیں۔ وہ دین جوان کے دین کی مانند ہو اسے اسی طرح ہونا چاہئے۔ لیکن ہماری نظر میں دین یعنی صراط مستقیم یعنی بشریت کی راہ راست۔ دین کے مسئلے میں غیر جانبدار ہونے کے معنی ہیں بشریت کے لئے راہ راست کے معاملے میں غیر جانبدار رہنا۔ ہم کہتے ہیں کہ توحید انسانی سعادت سے تعلق رکھتی ہے انسان کے ذاتی سلیقے سے اس کا تعلق نہیں ہے اس قوم یا اُس قوم سے مربوط نہیں ہے۔

پس وہی لوگ حق بجانب ہیں جو توحید کو بشریت کے حقوق میں شمار کرتے ہیں۔ اگر ہم بھی یہ کہتے ہیں کہ توحید کو مسلط کرنے کے لئے جنگ جائز نہیں تو نہ تو اس کا سبب یہ ہے کہ یہ ان امور میں سے ہے جن کا دفاع نہیں کرنا چاہئے نہ اس لئے ہے کہ اس کا شمار حقوق انسانیت میں نہیں ہوتا بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ خود بذاتہ مسلط کی ہی نہیں جا سکتی۔ قرآن کریم نے بھی کہا ہے کہ: لَآ اِکْرَاهَ فِی الدِّیْنِ۔ ورنہ یہ حقیقتاً حقوق انسانیت میں سے ہے۔

آزادیٔ فکر یا آزادیٔ عقیدہ

یہاں ایک اور مسئلہ بھی ہے اور وہ مسئلہ یہ ہے کہ عقیدے کی آزادی کے معاملے میں ”آزادیٔ فکر“ اور ”آزادیٔ عقیدہ“ کے درمیان فرق ہے۔

فکر منطق ہے۔ انسان کے پاس قوت تفکر کے نام سے ایک قوت ہے کہ وہ تفکر منطق اور استدلال کی بنیاد پر مسائل پر غور و فکر اور انتخاب کر سکتا ہے۔ لیکن عقیدے کے معنی بندھنا اور گرہ کھانا ہے۔ بہت سے ایسے عقائد ہیں جو کسی فکری بنیاد کے حامل نہیں۔ ان کی بنیاد صرف اور صرف تقلید ہے متابعت ہے عادت ہے۔ حتیٰ وہ آزادیٔ بشر کے مزاحم ہیں۔

جس چیز پر ہم آزادی کے نکتۂ نظر سے گفتگو کرتے ہیں کہ اس میں انسان کو آزاد ہونا چاہئے وہ تفکر ہے۔ لیکن ایسے اعتقادات جو معمولی سی فکری بنیاد بھی نہیں رکھتے فقط ایک بندھے ہونا اور ایک روحی انجماد ہیں جو نسل در نسل منتقل ہو رہے ہیں وہ عین اسارت سراسر قید ہیں اور ان

عقائد کا قلع قمع کرنے کے لئے جنگ کرنا آزادی بشر کی مخالفت میں نہیں بلکہ آزادی بشر کی راہ میں جنگ کرنا ہے۔ وہ شخص جو ایک ایسے بت کے سامنے کھڑا ہو کر اس سے حاجت طلب کرتا ہے جسے خود اس نے اپنے ہاتھوں سے بنایا ہے' وہ قرآن کی تعبیر کے مطابق ایک انتہائی پست ترین حیوان ہے۔ یعنی اس شخص کا عمل معمولی سی بھی فکری بنیاد نہیں رکھتا۔ اگر اسکی فکر میں ذرہ برابر بھی جنبش پیدا ہو تو وہ یہ عمل انجام نہ دے۔ یہ صرف ایک بندھن اور انجماد ہے جو اس کے دل اور اس کی روح میں پیدا ہو گیا ہے' اور اس کی بنیاد اندھی تقلید یں ہیں۔ اسے بزور اس باطنی زنجیر سے نجات دلانی چاہئے' تاکہ وہ سوچ سکے' غور و فکر کر سکے۔

لہٰذا وہ لوگ جو آزادی تقلید اور روحی زنجیروں میں جکڑے رہنے کی آزادی کو آزادی عقیدہ قرار دیتے ہیں' وہ غلط فہمی کا شکار ہیں۔ جس چیز کے ہم طرفدار ہیں' وہ آیت قرآن "لَا اِکْرَاہَ فِی الدِّیْن" کے مطابق' آزادی فکر ہے' آزادی عقیدہ نہیں۔ اس بارے میں ہم بعد میں بھی گفتگو کریں گے۔

چوتھا خطاب

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

"قَاتِلُوا الَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ وَ لَا بِالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَ لَا یُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ وَ لَا یَدِیْنُوْنَ دِیْنَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ حَتّٰی یُعْطُوا الْجِزْیَۃَ عَنْ یَّدٍ وَّ ھُمْ صٰغِرُوْنَ."

ہماری گفتگو جہادِ اسلامی کے بارے میں تھی۔ تین نکات ہیں جنہیں آج شب آپ کی خدمت میں عرض کیا جائے گا۔ (ان نکات میں سے) ایک تفسیری اور اصطلاحاً قرآنی پہلو کا حامل ہے اور ایک دوسرا عقلی ابحاث میں سے ہے۔ تیسری بحث بھی ہے جو قرآنی پہلو بھی رکھتی ہے اور تاریخی پہلو کی حامل بھی ہے۔

وہ بحث جو قرآنی ہے' وہ آیاتِ جہاد سے تعلق رکھتی ہے۔ جیسا کہ ہم نے پہلے عرض کیا ہے آیاتِ جہاد میں بعض آیات علمائے اصول کی اصطلاح میں مطلق ہیں اور بعض مقید۔

آیاتِ مطلق سے مراد وہ آیات ہیں جن میں بغیر کسی قید اور شرط کے مشرکین یا اہلِ کتاب کے خلاف جہاد کا حکم دیا گیا ہے' اور آیاتِ مقید سے مراد وہ آیات ہیں جن میں خاص شرائط کے ساتھ حکم دیا گیا ہے' مثلاً کہا گیا ہے کہ اگر وہ تم سے جنگ کریں' یا حالتِ جنگ میں ہوں' یا تمہیں ان کی طرف سے خطرہ ہو اور تمہارے پاس ایسے قرائن موجود ہوں کہ وہ تمہارے خلاف جنگ کا ارادہ رکھتے ہیں' تو ان سے جنگ کرو۔

اب ہمیں کیا کرنا چاہیے؟

ان مطلق آیات کو لیں یا اُن مقید آیات کو؟

ہم نے عرض کیا ہے کہ گفتگو کا فن، جس کے کچھ حصے پر علمِ اصول میں بحث کی جاتی ہے، اس سے واقفیت رکھنے والے علما کی نظر میں مطلق اور مقید کے درمیان کوئی ٹکراؤ نہیں، جس کی بنیاد پر کہا جائے کہ اِن آیات کو لیں یا اُن آیات کو قبول کریں۔ بلکہ اگر ہمارے سامنے ایک مطلق یا ایک مقید (آیت) ہو، تو ہمیں اس مقید کو اس مطلق کے لیے توضیحی قرینے کے طور پر قبول کرنا چاہیے۔ لہٰذا اس وضاحت کے مطابق ہمیں جہاد کا وہی مفہوم سمجھنا چاہیے جسے مقید آیات نے بیان کیا ہے۔ یعنی آیاتِ قرآن جہاد کو بغیر قید و شرط کے واجب نہیں سمجھتیں، کچھ خاص شرائط کے ساتھ واجب قرار دیتی ہیں۔ اس حد تک ہم ایک دوسری گفتگو میں عرض کر چکے ہیں۔

کیا آیاتِ جہاد ناسخ اور منسوخ ہیں

بعض مفسرین نے یہاں پہنچ کر ناسخ اور منسوخ کا مسئلہ اٹھایا ہے۔ یعنی انہوں نے کہا ہے کہ بہت سی قرآنی آیات میں، جیسے کہ آپ کہتے ہیں کفار کے ساتھ جنگ کو مشروط کیا گیا ہے، لیکن بعض دوسری آیات نے آکر ان تمام احکامات کو یکسر منسوخ کر دیا ہے، لہٰذا یہاں ناسخ اور منسوخ کی بحث آجاتی ہے۔ سورۂ برائت کی ابتدائی آیات جو کلی طور پر جہاد کا حکم دیتی ہیں اور جن میں مشرکین سے اظہارِ برائت کیا گیا ہے اور اُن کے لیے ایک مہلت مقرر کی گئی ہے، اور اس مہلت کے بعد کہتی ہیں کہ اب انہیں زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں، انہیں قتل کر دو، انہیں گھیرے میں لے لو، ان کی گھات میں بیٹھ جاؤ۔ یہ آیات جو نویں ہجری میں نازل ہوئیں، انہوں نے تمام گزشتہ احکام کو یکسر منسوخ کر دیا ہے۔

کیا یہ نکتۂ نظر درست ہے؟

یہ ایک غلط نکتۂ نظر ہے۔

(اس کے غلط ہونے کی) دلیل کیا ہے؟

اس کی دو دلیلیں ہیں۔ ایک دلیل یہ ہے کہ ہم کسی ایسے موقع پر ایک آیت کو ایک دوسری آیت کی ناسخ قرار دے سکتے ہیں جب وہ آیت اس کی یکسر ضد ہو۔ مثلاً اگر فرض کریں کہ ایک آیت کہتی ہے کہ مشرکین سے کسی صورت جنگ نہ کرو۔ پھر ایک دوسری آیت آتی ہے اور کہتی ہے کہ اس کے بعد ان سے جنگ کرو۔ خوب' اس کے معنی یہ ہیں کہ جو حکم ہم نے پہلے دیا تھا اسے منسوخ کر دیا ہے' اور اس کی جگہ ایک ثانوی حکم دیا ہے۔

ناسخ اور منسوخ کے معنی یہ ہیں کہ پہلا حکم باطل ہو جاتا ہے اور اس کی جگہ ایک ثانوی حکم لے لیتا ہے۔ پس دوسرے حکم کو پہلے حکم کی صد در صد ضد ہونا چاہئے۔ جس کے ذریعے اس حکم کو باطل سمجھا جا سکے۔ لیکن اگر دوسرا حکم اور پہلا حکم مجموعی طور پر ایک دوسرے کے ساتھ قابل جمع ہوں' یعنی ان میں سے ایک' دوسرے کی وضاحت کرنے والا ہو' تو یہاں ناسخ اور منسوخ کا مسئلہ ہی نہیں' جس کی بنیاد پر یہ کہا جائے کہ ایک دوسرے کو باطل کرنے کے لئے آیا ہے۔

سورۂ برائت کی آیات اس طرح کی نہیں ہیں کہ ہم کہیں کہ انہوں نے پہلے والی آیات کو باطل کر دیا ہے' اور جہاد کو مشروط کر دیا ہے۔

کیوں؟

اس لئے کہ اسی سورۂ برائت میں' جب ہم ان تمام آیات کا ایک ساتھ مطالعہ کرتے ہیں' تو دیکھتے ہیں کہ مجموعی طور پر وہ کہتی ہیں کہ اس وجہ سے ان مشرکین سے جنگ کرو کہ یہ کسی انسانی اصول' وعدے کی پابندی جو ایک فطری اور وجدانی امر ہے' اور حتیٰ اگر ایک ایسی قوم جس کے پاس کوئی قانون نہ ہو' وہ بھی اپنی فطرت کی بنیاد پر یہ بات جانتی ہے کہ اپنے عہد و پیمان کی وفا کرنی چاہئے' (لیکن یہ مشرکین اپنے وعدے) کے پابند نہیں ہیں۔ ان کے ساتھ اگر معاہدہ بھی کرو' تو جوں ہی موقع ملتا ہے یہ اسے توڑ ڈالتے ہیں۔ انہیں جس لمحے بھی تمہیں مٹانے اور نابود کرنے کا موقع ملتا ہے' وہ تمہیں مٹا ڈالتے ہیں۔

اس مقام پر عقل کیا کہتی ہے؟

عقل کہتی ہے کہ اگر کسی قوم کے بارے میں آپ کو ایسے قرائن ملیں کہ وہ پہلی فرصت میں آپ کو مٹا دینے پر تلی بیٹھی ہے' تو کیا آپ یہ کہیں گے کہ ٹھہرو پہلے وہ تمہارا خاتمہ کرلیں اس کے بعد تم انہیں ختم کرنا!!

اگر ہم ٹھہریں گے تو وہ ہمیں ختم کرڈالیں گے۔ آج بھی دنیا میں ایسے حملے کو جو ایسے قطعی اور یقینی قرائن کی بنیاد پر کیا جائے جن کے مطابق حملہ کرنے والے پر یہ بات واضح ہوگئی ہو کہ مخالف فریق اس پر حملے کا ارادہ رکھتا ہے' لہٰذا اگر وہ پہل کرے اور اس پر حملہ کرے' تو سب کہتے ہیں کہ یہ جائز ہے' اس نے صحیح کیا ہے۔ کوئی یہ نہیں کہتا کہ ٹھیک ہے تم جانتے تھے اور تم تک یقینی خبر پہنچ گئی تھی کہ مثلاً فلاں روز دشمن حملہ کرے گا لیکن تمہیں آج اس پر حملہ کرنے کا حق نہیں تھا۔ تمہیں صبر کرنا چاہئے تھا اور اپنے ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھے رہنا چاہئے تھا' جب وہ تم پر حملہ کرتا تب تم اُس پر حملہ کرتے!!

قرآنِ مجید سورۂ برائت کی انہی آیات میں' جو جہاد کے موضوع پر قرآنِ مجید کی سخت ترین آیات ہیں' فرماتا ہے: كَيْفَ وَ اِنْ يَّظْهَرُوْا عَلَيْكُمْ لَا يَرْقُبُوْا فِيْكُمْ اِلًّا وَّ لَا ذِمَّةً يُرْضُوْنَكُمْ بِاَفْوَاهِهِمْ وَ تَاْبٰى قُلُوْبُهُمْ (۱)

کہتا ہے کہ اگر انہیں موقع ملے تو یہ کسی عہد و پیمان کے وفادار نہ رہیں۔ یہ جو کچھ کہتے ہیں زبانی باتیں ہیں' جبکہ ان کے دل اس کے برخلاف ہیں۔

لہٰذا یہ آیات اس طرح بھی مطلق نہیں جیسا کہ آپ خیال کرتے ہیں۔ درحقیقت یہ آیات یہ کہتی ہیں کہ جس موقع پر آپ دشمن کی جانب سے خطرہ محسوس کررہے ہوں' اس موقع پر ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہنا اور تاخیر کرنا غلط ہے۔ پس اس بنیاد پر یہ آیات ان آیات کی ضد اور ان کے

۱۔ ان کے ساتھ کس طرح رعایت کی جائے' جبکہ اگر یہ تم پر غالب آجائیں تو نہ کسی ہمسائیگی اور قرابت کا خیال کریں گے اور نہ کوئی عہد و پیمان پیش نظر رکھیں گے۔ یہ تو صرف زبانی تم کو خوش کررہے ہیں' ورنہ ان کا دل قطعی منکر ہے۔ (سورۂ توبہ۹۔ آیت ۸)

برعکس نہیں، کہ ہم انہیں ناسخ سمجھیں۔ یہ ان آیات کے ناسخ نہ ہونے کے بارے میں ہمارا ایک نکتہ اور دلیل ہے۔

مامن عام الا وقد خص کا اصول

(ہماری) دوسری دلیل وہ نکتہ ہے جسے علمائے علمِ اصول نے بیان کیا ہے۔ اگر ہم اسے آپ کی خدمت میں واضح کر سکے تو اس آیت کے بارے میں اپنا نکتۂ نظر بیان کر سکیں گے۔

کہتے ہیں کہ "مامن عام الا وقد خص"۔ یعنی کوئی قانون ایسا نہیں ہے جس میں ایک طرح کا استثنا نہ پایا جاتا ہو۔ بات صحیح بھی ہے۔ مثلاً ہم سے کہا گیا ہے کہ روزہ رکھو اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ جب سفر پر ہو تو روزہ نہ رکھو، جب بیمار ہو تو روزہ نہ رکھو۔ نماز میں بھی اسی طرح ہے۔ نماز کے علاوہ اور معاملات میں بھی اسی طرح ہے۔ کہتے ہیں کہ کوئی ایک قانونِ کلی بھی ایسا نہیں جو استثنا کا حامل نہ ہو۔ خود اس قاعدے میں بھی کہ "کوئی قانون ایسا نہیں جس میں استثنا نہ ہو" استثنا پایا جاتا ہے۔

بعض قانون ایسے ہوتے ہیں جن میں واقعاً استثنا نہیں پایا جاتا، وہ استثنا کو قبول نہیں کرتے۔ مراد یہ ہے کہ بعض امور ایسے ہیں جن میں تخصیص نہیں پائی جاتی، یعنی ان میں استثنا نہیں پایا جاتا۔ ان امور کا انداز ایسا ہوتا ہے کہ یہ انداز استثنا پذیر نہیں۔ مثلاً قرآن مجید میں آیا ہے کہ: وَاِنْ تَشْكُرُوْا يَرْضَهُ لَكُمْ (سورہ زمر ۳۹۔ آیت ۷) اگر تم خدا کا شکر ادا کرو گے، تو خدا اس بات کو پسند کرتا ہے۔ یہ وہ کلی ہے جو استثنا قبول نہیں کرتا۔ یعنی یہ ممکن نہیں کہ انسان حقیقتاً شاکر ہو لیکن خدا اسے پسند نہ کرے۔ نہیں، یہ وہ چیز نہیں جو کسی موقع پر بالخصوص کسی اور طرح کی ہو، ما سوا یہ کہ وہ شکر ہی نہ ہو۔

ناسخ اور منسوخ کے معاملے میں بھی اسی طرح ہے۔ بعض قاعدے ایسے ہیں جو بنیادی طور پر منسوخ نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ نسخ کے معنی یہ ہیں کہ منسوخ ایک عارضی امر ہے۔ یعنی وہ قاعدہ ایک ایسا قاعدہ ہے جو عارضی ہونے کو قبول نہیں کرتا ہے، یہ اگر ہو گا تو دائمی ہو گا۔ کس طرح؟ (اس سلسلے میں) اب آپ کی خدمت میں مثال عرض کرتے ہیں۔

مثلاً اگر قرآنِ مجید میں آیا ہے کہ: لَا تَعْتَدُوْا اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ الْمُعْتَدِیْنَ (سورۂ بقرہ ۲۔ آیت ۱۹۰) یعنی زیادتی نہ کرو کیونکہ خدا زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ یہاں افراد کے لحاظ سے ایک عمومیت ہے اور زمانے کے لحاظ سے ایک استمرار ہے۔ کیا اس قانونِ کلی کے بارے میں ہم استثنا کے قائل ہو سکتے ہیں' اور کہہ سکتے ہیں کہ خدا ظالم کو پسند نہیں کرتا' سوائے بعض ظالموں کے؟! یعنی ایک طرف خدا کی قدوسیت و پاکیزگی اور دوسری طرف ظلم کی پلیدی و نجاست' آپس میں مل سکنے والی چیز نہیں' جس کی بنیاد پر ہم کہہ سکیں کہ خدا ظلم کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا' سوائے فلاں اور فلاں صاحب کے۔ یہ قانونِ کلی "سوائے" کو قبول نہیں کرتا۔ یہ "روزہ رکھنے" جیسی چیز نہیں کہ ہم کہیں کہ جناب روزہ رکھئے' سوائے ایسی صورت کے۔ ہاں' ممکن ہے انسان بعض حالات میں روزہ نہ رکھے۔ لیکن ظلم ایسی چیز نہیں ہے جس کے متعلق یہ کہا جاسکے کہ بعض حالات میں ظلم کرو اور بعض حالات میں ظلم نہ کرو۔ کسی بھی صورت میں ظلم نہیں کرنا چاہیے۔ دوسروں کو چھوڑ یئے خدا نے انبیا سے بھی ظلم کو ناپسند کیا ہے۔ یہ معصیت اور نافرمانی کی مانند ہے۔ خدا کسی نافرمان کو پسند نہیں کرتا۔ یہاں یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اپنے انبیا کے سوا (معصیت کاروں کو پسند نہیں کرتا)' نہیں اپنے انبیا سے بھی نہیں۔ اگر معاذ اللہ انبیائے الٰہی بھی معصیت کے مرتکب ہوں' تو خدا انہیں بھی پسند نہیں کرتا۔ پیغمبر اور غیر پیغمبر کے درمیان فرق یہ ہے کہ وہ معصیت نہیں کرتے جبکہ دوسرے معصیت کرتے ہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ انبیا معصیت کرتے ہیں اور خدا ان کی معصیت کے باوجود انہیں پسند کرتا ہے۔ اسے عامی کہتے ہیں جو تخصیص اور استثنا قبول نہیں کرتا۔

زمانے کے اعتبار سے بھی ایسا ہی ہے۔ کیا یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ ایک ایسا قانون ہے جو ایک خاص زمانے سے مخصوص ہے۔ ایک معین زمانے میں خدا نے زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں کیا لیکن دس سال بعد خدا نے اس حکم کو کالعدم کردیا ہے' اور کہا ہے کہ میں آج کے بعد ظلم کرنے والوں کو پسند کرتا ہوں؟ یہ ایک ایسا قاعدہ نہیں ہے جو منسوخ ہو سکے۔

آیاتِ جہاد میں ہم دیکھتے ہیں کہ قرآنِ کریم اس قاعدے کے ساتھ آغاز کرتا: قَاتِلُوْا فِی

سَبِیْلِ اللهِ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَکُمْ وَ لَا تَعْتَدُوْا اِنَّ اللهَ لَا یُحِبُّ الْمُعْتَدِیْنَ (سورۂ بقرہ ۲۔ آیت ۱۹۰) ان لوگوں کے خلاف جو تم سے لڑتے ہیں' ان لوگوں کے خلاف جنہوں نے تم پر زیادتی کی ہے' جنگ کرو۔ البتہ تمہیں زیادتی نہیں کرنا چاہئے۔

زیادتی کرنے والے سے جنگ کرنا زیادتی نہیں ہے۔ لیکن جس نے زیادتی نہ کی ہو' اس سے لڑنا زیادتی ہے' اور (یہ عمل) جائز نہیں۔ زیادتی کرنے والے سے لڑو تاکہ زیادتی وجود میں نہ آئے۔ لیکن اگر تم زیادتی نہ کرنے والے سے لڑو گے' تو تم خود زیادتی کرنے والے ہو۔ یہ وہ امر نہیں ہے جو منسوخ ہو سکے۔ مثلاً ہو سکتا ہے کہ کچھ مدت تک جہاد اور دفاع کی اجازت نہ ہو اور کہا جائے کہ مصلحت کی خاطر کچھ عرصے صبر کرو' برداشت کرو' اس کے بعد جہاد کا حکم دیا جائے۔ یعنی صبر کا حکم منسوخ کر دیا جائے' کیونکہ یہ ایک عارضی مدت کے لئے تھا۔ یہ حکم جسے منسوخ کیا گیا ہے' اس کے معنی یہ ہیں کہ اسے پہلے ہی سے عارضی قرار دیا گیا تھا۔

انسانی اقدار کا دفاع

لہٰذا قرآن کریم جہاد کو صرف اور صرف ایک قسم کا دفاع سمجھتا ہے' اور صرف اس وقت اس کی اجازت دیتا ہے جب زیادتی واقع ہوئی ہو۔ لیکن ہم نے گزشتہ ہفتے عرض کیا تھا کہ انسانی اقدار کے فروغ کے لئے جہاد کی مذمت نہیں کی جا سکتی' چاہے انہیں کوئی خطرہ لاحق نہ بھی ہو۔ نیز یہ بھی کہا تھا کہ جارحیت کا مسئلہ ایک عمومی مفہوم ہے۔ یعنی ضروری نہیں ہے کہ انسان کی جان پر حملہ کیا جائے' ضروری نہیں ہے کہ مال پر جارحیت کی جائے' لازم نہیں کہ عزت و آبرو پر وار ہو' ضروری نہیں کہ سرزمین میں دراندازی ہو۔ حتیٰ ضروری نہیں ہے کہ خودمختاری پر تجاوز ہو' لازم نہیں کہ آزادی پر حملہ ہو۔ اگر کوئی قوم ان اقدار پر حملہ کرے جو انسانی اقدار شمار ہوتی ہیں' تب بھی جارحیت ہے۔

آپ کی خدمت میں ایک سادہ سی مثال پیش کرتے ہیں:

ہمارے زمانے میں بعض بیماریوں کو جڑ سے ختم کر دینے کے سلسلے میں بہت زیادہ کوششیں کی جارہی ہیں۔ ابھی تک بعض بیماریوں مثلاً سرطان کا بنیادی سبب معلوم نہیں ہو پایا ہے' اور نتیجے کے طور پر اس کا علاج بھی دریافت نہیں ہو سکا ہے۔ البتہ فی الحال کچھ ایسی ادویات ہیں جن کے ذریعے کچھ مدت تک ان بیماریوں کے اثرات سے محفوظ رہنے کے لئے استفادہ کرتے ہیں۔ اگر ہم فرض کریں کہ کوئی ادارہ ایک بیماری کا علاج دریافت کرلے' تو وہ ادارے جو اس بیماری کی موجودگی سے فائدہ اٹھاتے ہیں' اور وہ کارخانے جو ایسی دوائیں تیار کرتے ہیں جو صرف اسی بیماری میں کام آتی ہیں' اگر یہ بیماری نہ ہو' تو ممکن ہے انہیں لاکھوں کروڑوں ڈالرز کا نقصان اٹھانا پڑے۔ یہ لوگ اس وجہ سے کہ اُن کی مارکیٹ ختم نہ ہو جائے' خراب نہ ہو جائے' چاہیں کہ یہ دریافت جو انسانوں کے لئے اتنی دل پسند ہے' اسے ختم کر دیں' اس کے (تیار کرنے والے) افراد کو ختم کر دیں' دریافت شدہ فارمولوں کو ختم کر دیں' کہ کوئی جان نہ سکے کہ ایسی بھی کوئی چیز ہے۔

اب کیا انسانوں کے لئے اس قدر اہم اور مفید چیز کا دفاع کیا جانا چاہئے' یا نہیں؟

کیا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ کسی نے ہمارے مال اور ہماری جان پر تو حملہ نہیں کیا ہے؟ ہماری عزت و ناموس' ہماری خودمختاری اور ہماری سرزمین سے کسی کو واسطہ نہیں ہے۔ ایک بڑے میاں نے دنیا کے ایک گوشے میں ایک چیز دریافت کی ہے' اور ایک دوسرا اسے ختم کرنا چاہتا ہے' اس قصے سے ہمارا کیا لینا دینا؟

نہیں' یہ ہم سے کیا واسطہ' ہمارا کیا لینا دینا کہنے کی جگہ نہیں ہے۔ یہاں ایک انسانی قدر خطرے کی زد پر ہے۔ ایک انسانی قدر پر حملہ کیا گیا ہے۔ لہٰذا اگر اس مقام پر ہم جنگ اور مزاحمت پر آمادہ ہوں' تو کیا ہم جارح ہوں گے؟ نہیں' ہم جارح نہیں ہیں' بلکہ ہم نے جارحیت کے خلاف قیام کیا ہے' ہم نے زیادتی کرنے والے کے خلاف جنگ کی ہے۔

پس یہ جو ہم عرض کر رہے ہیں کہ جہاد کا موضوع دفاع ہے' تو اس سے ہماری مراد محدود معنی

میں دفاع نہیں ہے' کہ جناب اگر آپ پر کوئی تلوار' توپ و تفنگ کے ساتھ حملہ آور ہو تو آپ اپنا دفاع کیجیے۔ نہیں' اگر آپ پر یا آپ کی مادی زندگی کی کسی اہم چیز پر یا آپ کی زندگی کی معنوی اقدار میں سے کسی قدر پر' مختصر یہ کہ اگر کسی ایسی چیز پر حملہ ہو جو بشریت کے لئے عزیز و محترم ہو اور بشریت کی سعادت کی ضروریات میں شمار ہوتی ہو تو اس کا دفاع کیجیے۔

ہماری وہ گزشتہ بحث اس مقام پر دوبارہ زندہ ہو جاتی ہے کہ کیا توحید انسانوں کے نجی' انفرادی اور ذوقی مسائل سے تعلق رکھنے والے مسئلوں میں سے ہے' یا انسانی اقدار کا حصہ ہے۔ اگر انسانیت کی اقدار میں سے ہے' تو اس کا دفاع کرنا چاہئے۔ پس اگر ایک قانون میں کہا گیا ہو کہ ایک انسانی قدر کے عنوان سے توحید کا دفاع کرنا چاہئے' تو اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ جارحیت جائز ہے' (بلکہ) اس کے معنی یہ ہیں کہ توحید ایک معنوی قدر ہے اور دفاع کا دائرہ بھی اس قدر وسیع ہے کہ جو اس قسم کی معنوی اقدار کا احاطہ کرتا ہے۔

جی ہاں' اس کے باوجود جس نکتے کو ہم نے بیان کیا ہے اسے دوبارہ دھراتے ہیں۔ اسلام یہ نہیں کہتا کہ توحید کو مسلط کرنے کے لئے جنگ کرو' کیونکہ (توحید) مسلط نہیں کی جا سکتی' کیونکہ یہ ایمان ہے' ایمان کو جان پہچان کر منتخب کرنا چاہئے۔ جاننے پہچاننے میں زور زبردستی نہیں ہو سکتی' لہٰذا انتخاب میں بھی زور زبردستی ممکن نہیں۔ لَآ اِکْرَاہَ فِی الدِّیْنِ۔ یعنی تم کسی کو مجبور نہ کرو۔ مراد یہ ہے کہ ایمان میں جبر نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن لَآ اِکْرَاہَ فِی الدِّیْنِ کے معنی یہ نہیں ہیں کہ آپ دائرۂ توحید کا بھی دفاع نہ کیجیے' اگر آپ دیکھیں کہ کچھ لوگوں کی طرف سے لا الہ الا اللہ کو خطرہ لاحق ہے' تو آپ اس خطرے سے اس کا تحفظ نہ کیجیے۔

آزادیٔ عقیدہ یا آزادیٔ فکر

لیکن یہ ایک علیحدہ مسئلہ ہے کہ دین کو لوگوں پر مسلط نہیں کیا جانا چاہئے اور لوگوں کو دین کے انتخاب کے سلسلے میں آزاد ہونا چاہئے اور یہ ایک دوسرا مسئلہ ہے کہ ''عقیدہ'' آج کی اصطلاح میں آزاد ہے۔ بالفاظ دیگر ''تفکر اور انتخاب آزاد ہے'' ایک بات ہے اور ''عقیدہ آزاد ہے'' ایک

دوسری بات۔

بہت سے عقائد اور اعتقادات فکری بنیادوں کے حامل ہیں۔ یعنی بہت سے اعتقادات کو انسان نے جاننے اور پہچاننے کے بعد منتخب کیا ہے۔ انسان میں جو وابستگی اور قلبی تعلق پیدا ہوتا ہے اکثر مواقع پر وہ جاننے پہچاننے کے بعد انتخاب کا نتیجہ ہوتا ہے۔ لیکن کیا انسان کے تمام عقائد فکر' تشخیص اور انتخاب پر مبنی ہیں؟ یا انسان کے اکثر عقائد کسی طرح کی وابستگیوں کا نتیجہ ہوتے ہیں' جن کی کوئی فکری بنیاد نہیں ہوتی' جذباتی بنیاد رکھتے ہیں' جیسے کہ قرآنِ کریم نے نسلاً بعد نسلٍ تقلید کے بارے میں بیان کیا ہے کہ: اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَاءَنَا عَلٰٓی اُمَّةٍ وَّ اِنَّا عَلٰٓی اٰثٰرِهِمْ مُّقْتَدُوْنَ (ہم نے اپنے باپ دادا کو ایک طریقے پر پایا ہے اور ہم انہی کے نقشِ قدم کی پیروی کرنے والے ہیں۔ سورۂ زخرف ۴۳۔ آیت ۲۳)

قرآنِ کریم نے اس مسئلے پر بہت زیادہ زور دیا ہے۔ اسی طرح وہ عقائد ہیں جو اکابرین کی پیروی میں قبول کیے جاتے ہیں۔ بنیادی طور پر ان مقامات پر آزادیٔ عقیدہ کا کوئی مفہوم نہیں' کیونکہ آزادی کے معنی ہیں ایک فعال اور آگے بڑھنے والی قوت کی سرگرمیوں میں حائل رکاوٹ کو دور کرنا۔ لیکن ان (مذکورہ) معنی میں عقیدہ ایک قسم کا جمود اور ٹھہراؤ ہے۔ جمود اور ٹھہراؤ کے سلسلے میں آزادی' ایک قیدی کے قید میں رہنے اور ایک زنجیر میں بندھے ہوئے انسان کے یونہی بندھے رہنے کی آزادی کے مساوی ہے۔ فرق یہ ہے کہ جسم کا قیدی اور زنجیر میں جکڑا ہوا اپنی اس حالت کو محسوس کرتا ہے لیکن روح اپنے قیدی اور زنجیر میں جکڑے ہوئے ہونے کو محسوس نہیں کرتی۔ یہی وجہ ہے جو ہم کہتے ہیں کہ عقیدے کی ایسی آزادی جس کی بنیاد آزادانہ غور و فکر نہیں بلکہ ماحول کی تقلید اور پیروی ہے' بے معنی ہے۔

جزیہ

ایک اور مسئلہ جسے بحث کے آخر میں بیان کیا جانا ضروری ہے' وہ "جزیہ" ہے۔ آیۂ کریمہ کے متن میں آیا ہے کہ اہلِ کتاب (مطلقاً یا وہ جن کا ایمان حقیقی اور واقعی نہیں) کے ساتھ جنگ

کرو یہاں تک کہ وہ جزیہ دے دیں۔

جزیہ کیا ہے؟

کیا جزیہ کے معنی خراج دینا یا خراج لینا ہیں؟

مسلمان جو گزشتہ زمانے میں جزیہ وصول کیا کرتے تھے' کیا درحقیقت اور فی نفسہ خراج وصول کرتے تھے؟

خراج جس شکل میں بھی ہو' جبر اور ظلم ہے اور خود قرآن کریم ظلم کی ہر شکل اور ہر صورت کی نفی کرتا ہے۔

جزیہ' جزا کے مادے سے ہے۔ عربی لغت میں جزا' اجر و عوض کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے اور (بدلے اور) سزا کے معنی میں بھی۔ اگر یہاں جزیہ' سزا کے طور پر ہو' تو کوئی دعویٰ کر سکتا ہے کہ اس کا مفہوم خراج وصول کرنا ہے۔ لیکن اگر اس کا مفہوم اجر و عوض ہو (جو ہے) تو موضوع تبدیل ہو جائے گا۔

ہم پہلے عرض کر چکے ہیں کہ بعض لوگوں کا دعویٰ ہے کہ بنیادی طور پر ''جزیہ'' عربی نہیں بلکہ معرب لفظ ہے اور فارسی بھی ہے۔ یہ لفظ ''گزیہ'' کا معرب ہے اور ''گزیہ'' فارسی لفظ ہے اور یہ فی کس لیا جانے والا وہ ٹیکس ہے جسے سب سے پہلے نوشیروان نے ایران میں وضع کیا۔ جب یہ لفظ عربوں کے درمیان آیا' تو معمول کے مطابق ''گ'' کا لفظ ''ج'' میں بدل گیا اور عرب ''گزیہ'' کی بجائے ''جزیہ'' بولنے لگے۔ پس جزیہ سے مراد مالیات ہیں اور ظاہر ہے کہ مالیات دینا خراج وصول کرنے سے علیحدہ چیز ہے۔ خود مسلمان بھی مختلف قسم کے مالیات ادا کرتے ہیں' جو چیز (قابلِ توجہ) ہے وہ مالیات کی شکل ہے۔ اہلِ کتاب کے مالیات' ان مالیات سے مختلف ہیں جو مسلمان ادا کرتے ہیں۔ لیکن یہ وہ رائے ہے جو کسی ایک دلیل پر نہیں کھڑی ہوئی۔ اس کے بعد ہم بھی لغت سے سروکار نہیں رکھیں گے۔ لغت کی بنیاد کچھ بھی ہو' ہوا کرے۔ ہمیں چاہیے کہ ہم جزیہ کے بارے میں اسلام کے وضع کردہ احکام کی رو سے دیکھیں کہ جزیہ کی ماہیت کیا ہے؟

جزیہ اجر و عوض ہے یا سزا؟

بالفاظِ دیگر ہمیں دیکھنا چاہئے کہ اسلام جو جزیہ وصول کرتا ہے' وہ عوض اور بدلے کی شکل میں وصول کرتا ہے' یا خراج کی صورت میں۔ اگر جزیہ کے مقابل کوئی ذمے داری لیتا ہے اور ان کی کوئی خدمت کرتا ہے' تو پھر یہ عوض ہے' لیکن اگر بغیر کچھ دیئے صرف پیسے وصول کرتا ہے' تو خراج ہے۔

ایک مرتبہ اسلام کہتا ہے کہ اہلِ کتاب سے جزیہ وصول کرو' لیکن اس کے عوض کوئی ذمے داری نہ اٹھاؤ' صرف ان سے رقم وصول کرو' اس بات کے لئے رقم وصول کرو کہ تم ان سے جنگ نہیں کرو گے' (ایسی صورت میں) یہ خراج ہے۔ خراج وصول کرنا' یعنی حقِ طاقت وصول کرنا۔ یعنی ایک طاقت ور شخص اپنے سے کمزور شخص سے کہتا ہے کہ تم مجھے اتنی رقم ادا کرو تاکہ میں تمہارے مزاحم نہ ہوں' تمہارا راستہ چھوڑ دوں' تمہارے امن و سلامتی کو سلب نہ کروں۔ ایک مرتبہ کہتا ہے کہ میں تمہارے بارے میں ایک ذمے داری قبول کرتا ہوں اور اس کے عوض جزیہ وصول کرتا ہوں۔ اس صورت میں جزیہ کا مفہوم عوض ہے۔ چاہے یہ عربی زبان کا لفظ ہو' چاہے فارسی زبان کا۔ ہمیں خود قانون کے مادّے پر توجہ کرنی چاہئے۔

جس وقت ہم قانون کی ماہیت کا جائزہ لیتے ہیں' تو دیکھتے ہیں کہ جزیہ ان اہلِ کتاب پر عائد ہوتا ہے جو مملکتِ اسلامی کے سائے میں زندگی بسر کرتے ہیں' جو حکومتِ اسلامی کی رعایا ہیں' حکومتِ اسلامی اپنی قوم پر کچھ فرائض عائد کرتی ہے اور ان کے مقابل ان کی کچھ ذمے داریاں اٹھاتی ہے۔ فرائض یہ ہیں کہ سب سے پہلے انہیں چاہئے کہ کچھ مالیات ادا کریں جن سے اسلامی حکومت کے اخراجات کا بندوبست ہو۔ ان مالیات میں وہ مالیات بھی شامل ہیں جو زکات کے طور پر لی جاتی ہیں اور وہ چیزیں بھی جو دوسرے عناوین سے وصول کی جاتی ہیں۔ مثال کے طور پر خراج یا مقاسمہ یا وہ مالیات جنہیں حکومتِ اسلامی اسلام کی مصلحتوں کے مطابق وضع کرتی ہے' لوگوں پر لازم ہے کہ انہیں ادا کریں اور اگر وہ یہ مالیات ادا نہیں کریں گے تو نتیجے کے طور پر حکومت

اسلامی کو مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا۔ کوئی حکومت ایسی نہیں جس کا کوئی بجٹ نہ ہوتا ہو اور وہ یہ تمام بجٹ یا اس کا کوئی حصہ کسی نہ کسی صورت سے لوگوں سے وصول نہ کرتی ہو۔ حکومت کو بجٹ کی ضرورت ہوتی ہے اور یہ بجٹ بھی براہ راست یا بالواسطہ مالیات (ٹیکسوں) کے ذریعے وصول کیا جانا چاہئے۔

دوسرا (فریضہ) یہ ہے کہ لوگ حکومت کے لئے (بوقت ضرورت) قربانی دینے اور اسکی خاطر لڑنے کے پابند ہیں۔ ممکن ہے کبھی کوئی خطرہ پیش آ جائے' تو انہی عوام میں سے افراد کو چاہئے کہ وہ دفاع سے لئے اٹھیں۔

اگر اہل کتاب حضرات حکومت اسلامی کے سائے میں زندگی بسر کر رہے ہوں' تو نہ تو ان پر ان اسلامی مالیات کی ادائیگی واجب ہے اور نہ ان پر جہاد میں شرکت فرض ہے' باوجود یہ کہ اس جہاد کا فائدہ انہیں بھی پہنچے گا۔ لہٰذا جب اسلامی حکومت عوام کے لئے امن و امان کا اہتمام کرتی ہے' اور انہیں اپنی مدد فراہم کرتی ہے' چاہے اس کے اپنے لوگ ہوں چاہے اپنوں کے علاوہ دوسرے لوگ ہوں' تو لوگوں سے بھی ایک مالی یا غیر مالی چیز کا تقاضا کرتی ہے۔ اہل کتاب سے زکات یا خراج اور مقاسمات کی بجائے جزیہ طلب کرتی ہے' حتیٰ فوجی خدمات کی بجائے بھی جزیہ طلب کرتی ہے۔

لہٰذا اسلام کے ابتدائی دور میں اسی طرح تھا۔ جب کبھی اہل کتاب رضا کارانہ طور پر مسلمانوں کی صفوں میں مسلمانوں کے حق میں جنگ کرنے آتے' تو مسلمان ان پر سے جزیہ اٹھا لیتے اور کہتے کہ ہم تم سے یہ جزیہ اس لئے وصول کرتے ہیں کہ تم سپاہی نہیں دیتے' اب جبکہ تم سپاہی دے رہے ہو' تو ہمیں تم سے جزیہ وصول کرنے کا حق نہیں۔

تفسیر منار میں تاریخ کی مختلف کتب سے بہت سے تاریخی شواہد جمع کئے گئے ہیں' جن کے مطابق ابتدائی زمانے کے مسلمان (اہل کتاب سے) فوجیوں کی بجائے جزیہ وصول کرتے تھے۔ وہ اہل کتاب سے کہا کرتے تھے کہ اب جبکہ آپ ہماری حکومت کے زیر سایہ زندگی بسر کر رہے ہیں' اور ہم آپ کے مدافع اور حمایتی ہیں لیکن آپ ہمیں فوجی فراہم نہیں کرتے (مسلمان بھی ان سے

فوجی قبول نہیں کرتے تھے) تو فوجیوں کی بجائے جزیہ ادا کیجئے اور اگر کبھی کسی موقع پر مسلمانوں کو (ان پر) اعتماد ہو جاتا تھا اور وہ ان کے فوجی قبول کر لیتے تھے' تو پھر (ان سے) جزیہ وصول نہیں کرتے تھے۔

اس بنیاد پر جزیہ کا مفہوم خواہ وہ عربی لغت میں جزا سے ماخوذ ہؤیا چاہے معرب ہو اور گزیہ سے بنا ہو' اس قدر بات قطعی ہے کہ قانونی مفہوم کے لحاظ سے حکومت اسلامی کے لئے اپنی غیر مسلم اہل کتاب رعایا کی طرف سے ایک معاوضہ ہے' اس خدمت کے بدلے جو وہ (اسلامی حکومت) ان کے لئے انجام دیتی ہے اور اس کے عوض کہ وہ ان سے فوجی طلب نہیں کرتی اور ان سے مالیات وصول نہیں کرتی۔

یہیں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ پہلا اعتراض جس میں کہتے ہیں کہ آخر کیوں اسلام جزیہ کی خاطر جنگ سے دستبردار ہو جاتا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اسلام جہاد کس مقصد کے لئے کرتا ہے؟ جہاد کا مقصد اپنا عقیدہ مسلط کرنا نہیں ہے۔ جہاد کا مقصد موانع اور رکاوٹیں ختم کرنا ہے۔ جب مقابل فریق کہتا ہے کہ ہماری تم سے جنگ نہیں۔ پس اس بنیاد پر جب وہ عقیدے کی تبلیغ کی راہ میں کوئی رکاوٹ پیدا نہیں کرتا اور جب وہ عقیدے کی تبلیغ کرنے میں کوئی مانع ایجاد نہیں کرتا' تو اسے بھی چاہئے کہ حکم قرآن: وَ اِنۡ جَنَحُوۡا لِلسَّلۡمِ فَاجۡنَحۡ لَهَا (سورۂ انفال ۸۔ آیت ۶۱) اگر وہ جھک جائیں اور اگر صلح و آشتی کے ساتھ بازو پھیلا دیں' تو پھر آپ بھی سختی نہ کیجئے' یہ نہ کہئے کہ نہیں' ہم صلح نہیں کریں گے' جنگ کریں گے۔ اب جب وہ صلح و آشتی کے ساتھ مل جل کر رہنے پر تیار ہے' تو تمہیں بھی اس کا اعلان کرنا چاہئے۔

آخر کار' اب جبکہ وہ تمہارے ساتھ اور تمہارے زیر سایہ زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں اور اب جبکہ اس کے نتیجے میں اسلامی مالیات بھی وہ نہیں دیتے اور نہ فوجی فراہم کرتے ہیں اور تمہیں بھی ان کے فوجیوں پر اعتماد نہیں' تو اب ان کے ہر فرد سے جزیہ کے نام سے ایک ٹیکس وصول کرو۔

اتفاقاً گوستاف لوبون اور جرجی زیدان جیسے یورپی اور عیسائی مورخین نے اس حوالے سے

خاصی گفتگو کی ہے۔ ول ڈیورنٹ نے تاریخِ تمدن کی گیارہویں جلد میں اسلامی جزیہ کے بارے میں گفتگو کی ہے اور کہا ہے کہ اس اسلامی جزیہ کی مقدار اس قدر کم ہوا کرتی تھی کہ جو مالیات خود مسلمانوں سے وصول کیے جاتے تھے ان سے بھی کم تھی۔ لہٰذا اس میں ظلم و ناانصافی کا کوئی پہلو موجود نہ تھا۔

ہماری مطبوعات

ہمارے ائمہؑ اور سیاسی جدوجہد	آیت اللہ سید علی خامنہ ای
دنیائے جوان	آیت اللہ سید محمد حسین فضل اللہ
فکر ونظر	آیت اللہ سید محمد حسین فضل اللہ
امام حسینؑ نے کیوں قیام فرمایا؟	علامہ ابراہیم امینی، محمد باقر شریعتی سبزواری
حسین ابن علیؑ کا خطاب	محمد صادق نجمی
حسین ابن علیؑ مدینہ تا کربلا	محمد صادق نجمی
نہج البلاغہ اور حیاتِ اجتماعی	شیخ حسن موسیٰ صفار
نوجوانوں کے لئے جاننے کی باتیں	رضا فرہادیان
ماہِ رمضان تزکیۂ نفس اور اصلاحِ کردار کا مہینہ	مجلسِ مصنفین
اسلامی تحریک قرآن وسنت کی روشنی میں	شیخ محمد حسن صلاح الدین
فقہ زندگی	آیت اللہ سید محمد حسین فضل اللہ
عبادت ونماز	استاد شہید مرتضیٰ مطہری
توبہ کیا ہے کیسے قبول ہوتی ہے	استاد شہید مرتضیٰ مطہری
بہترین عشق	جواد محدثی
عباد الرحمٰن کے اوصاف	محمد محمدی اشتہاردی
اسلام اور عصرِ حاضر کی ضروریات	استاد شہید مرتضیٰ مطہری
جہاد	استاد شہید مرتضیٰ مطہری
خاتمیت	استاد شہید مرتضیٰ مطہری (زیرِ طبع)
سیری در سیرۂ نبوی	استاد شہید مرتضیٰ مطہری (زیرِ طبع)
عدلِ الٰہی	استاد شہید مرتضیٰ مطہری (زیرِ طبع)
گفتارہائی معنوی	استاد شہید مرتضیٰ مطہری (زیرِ طبع)

دار الثقلین

استاد شہید مرتضیٰ مطہریؒ

استاد مرتضیٰ مطہریؒ فروری ۱۹۱۹ء میں ایران کے صوبہ خراسان کے فاریمان نامی قصبے میں پیدا ہوئے جو مشہد مقدس سے بہتر کلو میٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ ان کا تعلق ایک مذہبی گھرانے سے تھا اور ان کے والد حاجی شیخ محمد حسین مطہری ایک ممتاز عالم دین اور بلند کردار بزرگ تھے۔ استاد مطہری نے دینیات کی ابتدائی تعلیم اپنے والد بزرگوار ہی سے حاصل کی۔

بارہ سال کی عمر میں مرتضیٰ مطہری حوزہ علمیہ مشہد میں داخل ہوئے اور وہاں پانچ سال تک حصول علم میں مشغول رہے۔ بعد ازآں وہ دینی تعلیم کے عظیم مرکز قم چلے گئے جہاں پندرہ سال تک مشہور عالم فلسفی علامہ محمد حسین طباطبائیؒ اور مجاہد کبیر آیت اللہ روح اللہ خمینیؒ سمیت کئی جید علما کے زیر تربیت رہے اور اسلامی عقائد اور فقہ کی تعلیم مکمل کی۔ پھر وہ قم سے تہران منتقل ہو گئے۔

تعلیم کے دوران استاد مطہری نے محسوس کیا کہ کمیونسٹ اسلام کے خلاف ایک خفیہ منصوبے پر عمل پیرا ہیں اور وہ اپنے ناپاک ملحدانہ نظریات اسلامی فلسفے میں شامل کر کے اور آیات قرآنی کی مادی تعبیر کر کے اس مقدس دین کو مسخ کرنے اور اس کی روح کو برباد کرنے کی کوششوں میں مصروف ہیں۔ اس عظیم فتنے کا سدباب کرنے کے لئے انہوں نے مارکسی لٹریچر کا گہرا مطالعہ کیا تاکہ اس نظریے کا پورا پورا علم حاصل کر کے اس پر صحیح تنقید کر سکیں۔ چنانچہ انہوں نے اس موضوع پر متعدد کتابوں کا مطالعہ کیا اور ان کے کچھ حصے ازبر کر لئے۔

بلاشبہ مارکسزم وہ واحد چیز نہ تھی جس کی جانب استاد مطہری نے اپنی توجہ مبذول کی بلکہ اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے اپنی تحریروں میں تفسیر قرآن' فلسفہ' اخلاقیات' عمرانیات' تاریخ اور کئی ایک اور موضوعات پر بھی قلم اٹھایا۔ ان کی تمام تصانیف کا حقیقی مقصد اسلام پر کئے گئے اعتراضات کا جواب دینا اور دوسرے مکاتب فکر کی خامیاں اور اسلام کی عظمت واضح کرنا تھا۔ اس مقصد کے حصول کے لئے انہوں نے مخالف نظریات رکھنے والوں کو بحث و مباحثے کی دعوت بھی دی۔ تاہم استاد مطہری کا عقیدہ تھا کہ مارکسزم اور اسی جیسے دوسرے نظریات کو باطل ثابت کرنے کے لئے ضروری ہے کہ ان پر علمی انداز میں تنقید کرنے کے ساتھ ساتھ اسلام کا حقیقی چہرہ بھی پیش کیا جائے۔

ملحدانہ مکاتب فکر کے پیروکاروں کے لئے استاد مطہری کی سرگرمیاں ناقابل برداشت تھیں' چنانچہ انہوں نے آپ کو دہشت گردی کے ذریعے منظر عام سے ہٹا دینے کا فیصلہ کیا۔ بالآخر وہ اپنے مذموم مقاصد میں کامیاب ہوئے اور استاد مطہری یکم مئی ۱۹۷۹ء کو شہید کر دیئے گئے۔

استاد مطہری کی شہادت ایسا عظیم سانحہ تھی جس پر موت العالم موت العالم کا مقولہ صادق آتا ہے۔ امام خمینیؒ نے جب یہ روح فرسا خبر سنی تو شدت جذبات سے ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور انہوں نے اپنے تعزیتی پیغام میں فرمایا کہ "میں اپنے ایک عزیز فرزند سے محروم ہو گیا ہوں۔ میں اس شخص کی موت کا سوگ منا رہا ہوں جو میری زندگی کا حاصل تھا۔"

ہزاروں فرزندان توحید نے شہید کے جلوس جنازہ میں شرکت کی۔ انہیں حرم معصومہ قم کے احاطے میں دفن کیا گیا۔

استاد مطہری ایران کے دینی اور ادبی حلقوں کی ایک ممتاز شخصیت تھے۔ وہ ایک عرصے تک تہران یونیورسٹی میں شعبہ الٰہیات اور معارف اسلامی کے سربراہ رہے۔ شہادت کے وقت وہ اسلامی جمہوری ایران کی دستور ساز کونسل کے صدر کے عہدے پر فائز تھے اور اپنے فرائض نہایت خوش اسلوبی سے انجام دے رہے تھے۔ انہوں نے مختلف موضوعات پر بہت سی معرکتہ آراء کتابیں لکھی ہیں جو فارسی' عربی' ترکی' اردو اور انگریزی زبانوں میں شائع ہو چکی ہیں۔